اقبالیات پر مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریریں

ناشر

اقبال اکیڈمی

مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد ۵...۲۹ (اے پی) انڈیا

اقبالیاتِ ماجد

ناشر :
اقبال اکیڈیمی

قیمت : ۸ روپے
مطبوعہ :
جے۔ رام پرنٹرز، چھتہ بازار، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

بہ اہتمام :
مصلح الدین سعدی، جوائنٹ ایڈیٹر اقبال ریویو
محمد ظہیرالدین احمد، نائب صدر اقبال اکیڈیمی

سنہ اشاعت : اپریل ۱۹۷۹ء

ابتدائی صفحات : سلام خوشنویس

☆

ملنے کے پتے :
اقبال اکیڈیمی، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹ (اے پی) انڈیا
اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش بک ڈپو۔ سیف آباد۔ حیدرآباد
الیاس ٹریڈرس۔ شاہ علی بنڈہ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
مکتبۂ نشاۃِ ثانیہ۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
مکتبۂ صدقِ جدید۔ دریاباد۔ لکھنؤ (یو، پی)

فہرستِ مضامین

تحریراتِ ماجد

دو ایک باتیں

ذکر اقبال کے شعر و حکمت کا، مولانا ماجد کی زبانِ قلم سے ـــــ اِس پر اور کیا تبصرہ بَن پڑے۔ اقبال نے اپنے خیالات کے اظہار و ابلاغ کے لئے "حرفِ نیش دار" اور "حرفِ پیچ دار" دونوں کا خوب استعمال کیا۔ ان پر مولانا ماجد کی نظر بڑی گہری ہے۔ وہ الحاد و عقلیت کی راہ سے معرفت کی منزل تک پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ماجد کی تحریر میں ایک منفرد توازن ہے۔

زیرِ نظر تحریریں، بیشتر اقبال کی کتابوں پر تبصرہ کا حکم رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شذرات اور بیانات بھی ہیں جو "سچ" اور "صدق" میں شائع ہوئے۔ یہ تبصرے اگرچہ مختصر ہیں، لیکن مولانا ماجد کی نکتہ رَسی، جدّتِ فکر اور منفرد اندازِ بیان کے آئینہ دار ہیں۔
بڑی مسرت کی بات ہے کہ اقبال اکیڈمی حیدرآباد نے ان بکھرے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو کر صاحبانِ فکر و نظر کے آگے پیش کر دیا ہے۔
مجھے اُمید ہے کہ یہ کوشش علمی و ادبی حلقوں میں پسندیدگی حاصل کرے گی۔

سید خلیل اللہ حسینی
صدر اقبال اکیڈمی حیدرآباد

اقبالیاتِ ماجد

اگر ایک طرف علامہ اقبال حکیم، فلسفی اور شاعر ہیں تو دوسری طرف مولانا ماجد صاحب بھی فلسفی ہر نفسیات ادیب ہیں۔ ماجد صاحب کی اقبال شناسی کے کمال کے لئے ان کے یہ "دو لفظ" کافی ___ "اقبال فلسفی اور شاعر اور سو درویشوں کا ایک درویش ہے ___"

"شکوہ" اور "جواب شکوہ" کے مقالہ میں مولانا ماجد صاحب نے اقبال کی شوخ نگاری کی طرف ہ کیا ہے۔ خاص طور پر نظم "شکوہ" میں۔ "ہر طنز میں عبدیت کی چاشنی ہر گلہ میں توحید پرستی یرینی ہے ۔" مولانا نے ارمغانِ حجاز پر تبصرہ میں بھی بندہ کے ناز کو ان کی شوخ گفتاری کا ب قرار دیا ہے لکھتے ہیں "مقام ناز پر آکر معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کتنا شوخ گفتار ہو جاتا ہے۔ ظم سے اقبال کی اردو و اسلامی شاعری کی شہرت و عظمت کی اصل بنیاد پڑی ۔"

جو سوالات مضطرب دلِ مسلم نے اٹھائے تھے اور کلام میں کہیں کہیں تلخی بھی آگئی تھی ان کے زبان بند کرنے والے اور توبہ کا انقلاب پیدا کرنے والے جواب "جواب شکوہ" میں پیش ں۔ اپنی تعریف میں مسلمانوں کی طرف سے پچھلی تاریخی عظمتوں کے دعوے نہایت فصیح طرز بیان گے بڑھائے گئے تھے، اس کے جواباتِ شافی کا ایک نمونہ یہ ہے ؎

حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے ؛ تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

حجاز" پر تبصرہ کی اہم کڑی یہ ہے کہ ___ "بہترین اور موثر نظم اس حصہ میں کیا معنی کتاب میں وہ ہے جو "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کے عنوان سے ص۲۱۳ سے ص۲۱۸ تک آئی ر جس کے اندر اقبال کی ساری تعلیم کا مغز یا لبِ لباب آگیا ہے ___" ماجد صاحب خود شہور طنز نگار ہیں۔ اس نظم میں حقائقِ حیات و انقلاب کو بے پردہ کرنے میں اقبال کے قلم نے جو کمال دکھایا ہے وہ اس تبصرہ میں واضح کیا گیا ہے۔

مولانا ماجد نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ___ "ایک دور میرے اوپر کئی سال کا قوالی

ر سماع کا بھی رہا ۔ کلام اقبال کے اچھے خاصے ٹکڑے اپنے قوال کو بھی یاد کروا دیئے تھے۔
رجب جی چاہتا اپنے قوال سے ان کو سنا کرتا ـــــ ''حضرت ماجد صاحب نے اپنے ایک گزرے
ئے ایسے دور کا ذکر فرمایا ہے لیکن میں اپنے تجربات کی بناء پر محسوس کرتا ہوں کہ ملک و ملت
ں خوش الحان نوجوانوں کو ایسی قوالی کی تربیت دینی چاہئے جس میں صرف کلام اقبال ہی نہیں
ہ بہترین شاعروں کا منتخب کلام ان کو یاد دلایا جائے اور اس میں منتخب کلام کے ساتھ
زدن گرہیں بھی درج کی جائیں تاکہ ایسے کلام دلی تاثرات کی دنیا وسیع سے وسیع تر ہوتی
ـتے ۔ کلام اقبال کو ایسے منتخبات میں نہایت اہم مقام دیا جائے گا ــ اقبال نے اساتذہ
ے بعض اشعار کی تضمین سے اس نکتہ کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے ـــ

مولانا ماجد صاحب نے " اسلامی الہیات کی تشکیل جدید '' کے بارے میں یہ تاثر ظاہر
ایا ہے کہ ـــ " انگریزی نثر میں جہاں انھوں نے جدید فلسفہ کی شرح و ترجمانی کی ہے وہ
سلامی رنگ سے بار بار ہٹ گئے ہیں ــ '' لیکن اس میں دو چار واضح مثالیں بھی نقل نہیں
ی ہیں جس سے کچھ ایسے نمونے سامنے آتے کہ اسلامی رنگ سے ہٹ جانا کسے کہتے ہیں۔
قبال پر لکھنے والے عام اہل قلم کے بس کی بات نہیں ہے ۔ مولانا ماجد صاحب جیسے فلسفی ہی
لم اس کے لئے زیادہ موزوں ہوتا ۔

اقبالیات پر چھپنے والے ضخیم علمی مجلوں اور کتابوں کے مقابلہ میں یہ بھی ہونا چاہئے کہ
ت اقبال کو آسان سے آسان زبان اور پیرایہ بیان میں لوگوں کے سامنے لایا جاتا ہے
اقبال اکیڈیمی کے ارکان کی خدمت میں اس قدر ضرور عرض کروں گا اور وہ بھی مولانا ماجد
ی زبان میں ہیں کہ ـــ " مبارک ہے وہ قوم جس کو ایسا شاعر نصیب ہو' مبارک ہے
شاعر جو اپنی یادگار ایسا کلام چھوڑ جائے اور مبارک ہے وہ ناشر ہے جس کو ایسے کلام کی
اشاعت کی توفیق ہوئی ـــ ''

(ڈاکٹر) غلام دستگیر رشید
سابق صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ

تاریخ: ۱۴ر اپریل ۱۹۷۹ء
مقام: لال ٹیکری حیدر آباد دکن

حرفِ اوّل

مولانا عبدالماجد دریابادی، بیسویں صدی کے ہندوستان کی اُن شخصیتوں میں سے ہیں، جن کا تعلق ہندوستان
ری، تعمیری اور علمی زندگی سے بہت گہرا رہا۔ ہندوستانی مفکرین میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جو مشرق اور مغرب
ھری، فکری دھاروں میں مولانا کی طرح ہندوستان کی نمائندگی کر سکیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں
جلیل القدر ہستیاں زندگی کے مختلف میدانوں میں اُبھریں کہ ہندوستانی اُفق پر دانشوروں کی ایک کہکشاں سی
ھلی گئی ــــ علیگڑھ تحریک کی مایہ ناز ہستیاں، حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک، ڈپٹی نذیر احمد،
غ علی وغیرہ، بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد جو دوسرا گروپ اس کے
نسل کا سامنے آتا ہے، اُن میں مولانا ابوالکلام، علامہ اقبالؔ، محمد علی جوہرؔ، علامہ سلیمان ندوی، حسرتؔ موہانی وغیرہ
ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا اس نسل سے تعلق تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے، اور
۱۹ء میں انتقال فرمایا۔ (۸۳) برس کی عمر اور لوگوں نے بھی پائی ہوگی۔ لیکن ۲۰، ۲۲ سال کی عمر سے انتقال
مولانا ماجدؔ نے اپنے عصر کو اپنی ایک ایک سانس میں سموئے ہوئے ہر لمحہ کو ایک صدی کا مرتبہ بخشا۔

مولانا عبدالماجد، ایک صاحبِ طرز انشاپرداز، محقق، فلسفی اور نقاد کی حیثیت سے اپنی عمر کی ابتدائی
میں مشہور ہوئے ــــ اُردو کے علاوہ انگریزی میں بھی اپنے قلم کا لوہا منوایا۔ ان کے مضامین انگلستان
ور علمی پرچوں میں شائع ہوتے تھے۔ مسٹر عبدالماجد اُس زمانے کے اُن ہندوستانیوں میں شامل تھے جن کی عقلیت اور
نوازی کی ایک عالم میں شہرت تھی۔ الحاد اور مادیت کی دل خوش کُن وادیوں میں بھی اس عبقری نے عمر عزیز کے
ن بتائے ــــ حقیقت کی تلاش اور سچی علمی لگن ان کی زندگی کا ایک ایسا نصبُ العین تھا جس کی وجہ
ن کی دشت نوردیاں، ان کے مشاہدات اور تجربات انسانیت کے لئے اہم بن جاتے ہیں۔ ان کی زندگی
ری حادثے جدید تعلیم یافتہ انسانوں کے لئے چراغِ راہ سے کم نہیں۔ فلسفہ کی خارزار وادیوں میں آبلہ پائی
جب وہ زندگی کی معنویت اور خالقِ کائنات سے متعارف ہوتے ہیں تو مسٹر عبدالماجد کو دنیا مولانا عبدالماجد
م سے یاد کرتی ہے۔ اِن کے اس سفر کی رُوداد خود ان کے قلم سے ہی مزہ دیتی ہے۔ فرماتے ہیں:

" ۱۹۰۸ء میں عمر کا سولھواں سال تھا کہ میٹرک پاس کر، لکھنؤ میں کالج میں داخل ہوا، اور اب انگریزی
ں پر ٹوٹ پڑا۔ اتفاق سے شروع ہی میں ایک انگریز ڈاکٹر کی کتاب سامنے آگئی۔ ظالم نے کھُل کر اور بڑے
الفاظ میں مادّیت کی حمایت کی اور مذہب اور اخلاق دونوں سے بغاوت کی تھی ــــ خیالات ڈانوا ڈول ہونے
ــــ دماغ پہلے ہی سے مفلوج ہو چکا تھا، اب دل بھی مجروح ہو گیا ــــ ارتداد دبے پاؤں آیا۔ اسلامیت کو
یمان کو ہٹا خود مسلّط ہو گیا۔ الحاد کا نشہ، بے دینی کی ترنگ، ریشنلزم (عقلیت) سے پینگ بڑھتے ــــ
ٹیزم (لا ادریت) سے یارانہ گھٹا۔ لندن کی ریشنلسٹ اسوسی ایشن (انجمن عقلیین) کی ممبری قبول کر، سارا وقت
ل، اسپنسر، ہکسلے، ہیگل، انگرسول، بریڈلا، ایوشنز، ڈارون اور یونان کے حکماء مادین ــــ

شکلیں وغیرہ نذر ہونے لگا۔ رِل کو اتنا پڑھا، اتنا پڑھا کہ لڑکوں میں رِل کا حافظ مشہور ہوگیا ــ ایف اے
امتحان کی فیس جانے لگی تو فارم میں جہاں مذہب کا خانہ ہوتا وہاں بجائے مسلمان کے رلیشنلسٹ لکھ دیا۔ الحاد
ور بے دینی کا دَور کوئی آٹھ سال تک قائم رہا۔"

مولانا آگے لکھتے ہیں کہ ۱۹۱۸ء کے اواخر میں ایک دوست کی تحریک پر بُدھ مت پر انگریزی میں مطالعہ
روع کیا۔ اس کے بعد ہندو فلسفہ کے مطالعہ کا موقع ملا۔ مسز بیسنٹ اور بنارس کے مشہور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس
کے انگریزی تراجم اور تالیفات کے ذریعہ مغربیت مادیّت اور عقلیت کا جو نیز نشہ سوار ہوا تھا وہ بتدریج ہلکا ہونے
لگا۔ اِس مطالعہ سے یہ بات ان کے سمجھ میں آئی کہ مادّی اور حسّی دُنیا کے علاوہ بھی کسی اور عالَم کا وجود ہے۔ بھگوت
گیتا کے ترجمہ کو پڑھنے کے بعد خدا کا نام قابلِ مضحکہ نہیں رہا ــ اِسی زمانہ میں مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ کی
جلد اول ان کے ہاتھ لگی، اور رسالتمآب صلعم کے بارے میں یہ خیال اُن کے دِل میں پیدا ہوا کہ یہ ایک خوش نیّت
مصلح قوم تھے۔ مولانا اسی زمانے میں اکبر الٰہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر اور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی سے
اثر قبول کیا ــ ۱۹۱۹ء میں مثنوی معنوی ان کے ہاتھ لگی۔ مثنوی کے مطالعہ نے اِن کو اسلام سے قریب کردیا۔
قرآن و رسالت پر ابھی ایمان پختہ نہیں ہوا تھا، بلکہ خیال یہ تھا کہ جب مولانا روم جیسا مفکر اسلام کو سچ سمجھتا ہے
تو یہی سچ ہوگا۔

مولانا عبدالماجد مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے جب اسلام کو ایک نسخۂ کیمیا کی حیثیت میں اپنا لیا تو باقی
زندگی اِسی کے لیئے وقف ہوگئی۔ اُن کی ساری صلاحیتیں جو اِنشاء پردازی، غور و تفکر، تلاش و جستجو کے میدانوں
میں ظاہر ہوئیں، اور ہمارے لیئے اہم ورثہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام اور قرآن کے اطراف ہی پھیلی ہوی ہیں۔
اسی عصر میں علامہ اقبال بھی کم و بیش اپنے فکر و فن کے چراغ جلا رہے تھے۔ اقبال سے مولانا عبدالماجد کا ربط
اور فکرِ اقبال سے اُن کی دلچسپی اِن تحریروں سے ظاہر ہے جو یکجا سامنے آرہی ہیں۔ اقبال کی شخصیت، اُن کی کتابوں
پر اور ان کی فکر پر اختصار کے ساتھ لیکن بڑے ہی جامع انداز میں مولانا عبدالماجد کی یہ تحریریں اقبالیات میں ایک
منفرد مقام کی حامل ہیں۔ اقبال کے طالب علم اور مولانا عبدالماجد کے مدّاح دونوں یقیناً اِس کا استقبال کریں گے۔

اِس مواد کی فراہمی میں مولانا حکیم عبدالقوی صاحب مدیرِ صدق، کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ اِس اخلاص
اور علمی اعانت کے لئے اِدارہ ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے۔

اِدارہ

مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب

معتمد اسٹڈی سرکل کُل ہند مجلس تعمیرِ ملت کے نام[1]

بسم اللہ

صدق
دریاباد ضلع بارہ بنکی

مورخہ ۲۹ راپریل ۱۹۵۷ء
۲۸ ر رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ

پیام

حضرت اقبال مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور سارے ملک کے لئے عموماً ایک گنج بے بہا تھے۔ اگر ملک و ملت نے ان کے پیام بیداری اور خود آگاہی کو سُن لیا اور سمجھ لیا ہوتا تو کہنا ہی کیا تھا۔ اب خیر اتنا ہی غنیمت ہے کہ ان کا پیام دُہرایا جاتا، اور ان کی یاد منائی جاتی رہے۔

جس "خودی" کو انھوں نے بار بار اُبھارا ہے، اُسی کا نام مذہب کی زبان میں عبدیت یا رُوحانی خودداری ہے اور جس نے اس پیام کو سمجھ لیا، اُس نے اقبال کو سب کچھ سمجھ لیا۔

مبارک ہے آپ کی انجمن کہ اقبال فہمی کا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔

عبدالماجد

---

[1] ۱۹۵۷ء میں کُل ہند پیمانے پر حیدرآباد میں یومِ اقبال کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ اس موقع پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہ پیام روانہ کیا تھا۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد کی تشکیل میں یہ تقاریب اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔

اقبال سے واقفیت اُس وقت ہوئی جب میں اسکول کے کسی نیچے درجہ میں پڑھتا تھا غالباً سنہ۱۹۰۳ء میں اور اقبال اس وقت تک سند ڈاکٹریٹ سے سرفراز نہیں ہوئے تھے لیکن فلسفہ میں شہرت پائے ہوئے تھے۔ شہرت ان کے نام کو اس وقت بھی اچھی بھلی شاعری میں حاصل ہو چکی تھی اور حسرت موہانی کے ماہ نامہ اُردوئے معلیٰ میں۔۔۔۔۔۔۔ ان کی غزلوں پر کبھی کبھی تنقید چھپی کرتی تھی اور وہ بھی زیادہ تر زبان کے اعتبار و معیار سے بچپن کا زمانہ بھی کسی درجہ جہالت و نادانی کا ہوتا ہے وہ تنقیدیں بڑے شوق سے پڑھ کر یاد کر لیتا تھا اور ناواقفوں کے سامنے بڑے فخر و پندار سے انھیں اپنی جانب منسوب کر کے اقبال پر اعتراض کیا کرتا تھا گویا میں اتنا بڑا نقاد و سخن فہم ہوں کہ اقبال تک کو خاطر میں نہیں لاتا اور ان کی دھجیاں اڑا دیتا ہوں۔

جب سن اور آیا، اُردو شعر سمجھنے کی تھوڑی بہت تمیز آچلی (وہ بھی زیادہ تر مولانا شبلی اور حضرت اکبر الٰہ آبادی کے فیض صحبت سے) تو اپنی اس طفلانہ عادت پر خود بڑی نفرین کی اور اقبال کا کلام بڑے لطف و عقیدت سے پڑھنے لگا۔ خصوصاً ان کی فارسی مثنویاں اسرار خودی رموز بے خودی، اودھ پنچ (لکھنو) میں اب بھی ان پر سخت گروہ گیریاں چھپتی رہیں۔ لیکن اب انہیں خرافات کے درجہ میں سمجھنے لگا۔ اقبال کا ترانہ ملی اب گراموفون میں بھر لیا گیا تھا اور بعض خوش آوازوں کے گلے سے اس کے سننے کا اتفاق ہونے لگا تھا۔ محمد علی ان نظموں سے بڑے ہی متاثر تھے اور ان کے تاثر سے حصہ میں بے علم و بے ذوق بھی پورا لینے لگا تھا۔ ضرب کلیم

پیام مشرق، بال جبریل، جاوید نامہ ایک کے بعد دوسری شائع ہوتی رہیں، ایک ایک چیز شوق سے منگا کر بڑی بے قراری سے پڑھی۔ بعض پر خوب رویا بھی، اور بعض پر دل کٹ کر رہ گیا۔ فارسی کلام میں مولانا روم کی مثنوی میرے لئے ایک شمع ہدایت تھی۔ اس سے کچھ ایسا کم مرتبہ اقبال کی بھی مثنویوں ونظموں کا نہ رہا۔ ایک دور میرے اوپر کئی سال کا قوالی اور سماع کا بھی رہا۔ کلام اقبال کے اچھے خاصے ٹکڑے اپنے قوال کو بھی یاد کرا دیئے تھے اور جب جی چاہتا اپنے قوال سے اُن کو سُنا کرتا۔

ملاقات ایک بار لکھنو میں تو سنہ۱۲ء میں بالکل سرسری، اقبال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں آئے تھے میں اپنے شرمیلے پن سے نہ کچھ آگے بڑھ نہ سکا نہ کچھ زیادہ استفادہ کر سکا۔ پھر شاید سنہ۱۹۲۰ء میں اُن سے ملاقات حیدر آباد میں ہوئی وہ مدراس سے اپنے انگریزی لکچر دے کر واپس ہو رہے تھے، اور میرا جانا حسنِ اتفاق سے اس وقت حیدر آباد کا ہو گیا۔ ایک سے زائد ملاقاتیں رہیں اور اس کے بعد مراسلت کا سلسلہ ان کی وفات کے وقت تک جاری رہا۔ حضرت اکبر کو اقبال نے اپنے خط میں (میرے نشۂ فلسفیت کے زمانہ میں) لکھا "کہ آپ کے ماجد صاحب تو برگسان کی جیب میں رہتے ہیں"۔ حضرت اکبر نے جواب دیا کہ انشاء اللہ وہ وقت آئے گا جب برگسان ماجد صاحب کی جیب میں رہا کرے گا" اللہ ان دونوں بزرگوں کے مرتبے بڑھائے کیسا کیسا اپنے چھوٹوں کو بڑھاتے تھے۔

اقبال دینی اور اسلامی شاعر شروع ہی سے تھے سن کے ساتھ یہ رنگ پختہ سے پختہ تر شوخ سے شوخ تر ہوتا گیا۔ بعض نظمیں تو سو فیصدی سوزِ جگر کی ترجمان ہیں۔ البتہ اقبال کی نثر خصوصاً انگریزی نثر میں جہاں انھوں نے جدید فلسفہ کی شرح و ترجمانی کی ہے وہ اسلامی رنگ سے بار بار ہٹ ہٹ گئے ہیں۔ اقبال میں تندی شروع میں پائی جاتی تھی رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی گئی اور وہ توبہ و انابت کے خوگر ہوتے گئے پیشے کے لحاظ سے بیرسٹر تھے لیکن طبیعت و مزاج کے لحاظ سے اس کام کے کچھ زیادہ اہل نہ تھے، محمد علی یہ بھی ولایت پلٹ ہو کر ٹھیٹھ مسلمان بنے رہے اور وفاقِ اسلامی کے قیام کے داعی۔ محمد علی کے بعد شاید سب سے بڑے یہی تھے۔ وطنیت و وطن پرستی کے دورِ مذمت میں ان کی متعدد نظمیں یادگار بن گئی ہیں قیامِ پاکستان ایک بڑی حد تک انہیں کی تخلیقِ فکری کا نتیجہ تھا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک کے قطعِ منصبِ خلافت کو انھوں نے محمد علی ہی کی طرح کبھی معاف نہیں کیا تھا۔

پیامِ اقبال

ورنگل (دکن) کے جواں ہمت بوڑھوں اور جوانوں نے مل کر، پچھلے ماہ یومِ اقبال دھوم دھام سے منایا۔ تقریب کے موقع پر پیام، مدیر صدق سے بھی طلب ہوا تھا۔ الفاظ ذیل میں بھیج دیا گیا اور یہی جلسہ میں سنا دیا گیا۔

جس کی شاعری اول سے آخر تک ایک پیام ہی تھی، اس کی یادگار کے موقع پر پیام کوئی دو چار لفظوں کا کیا بھیجے! اقبال پر اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں کہ اسے شاعر یا فلسفی یا کچھ اور قرار دیا جائے۔ وہ تمام تر "پیامبر" تھا۔ حقیقی اور اصلاحی پیغمبر کا جانشین اور خادم۔ ساری زندگی گزار دی شرح و ترجمانی میں اسی لاہوتی پیام کے، ناسوتیوں کی زبان میں نئے نئے رنگ سے نئے نئے ڈھنگ سے، حکیمانہ عنوان سے، ادیبانہ شان سے۔

۲۰ مئی ۱۹۴۰ء
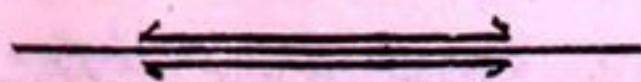
شکوہ اور جوابِ شکوہ

جو زبان خوگر تھی حمد و ثنا، شکر و مناجات کی وہ آخر ایک بار گلہ و شکوہ پر کھلی۔ یا یوں کہئے
کہ کھلوائی گئی۔ آقا کا کرم جب خود ناز برداری پر آمادہ ہو جائے تو کون بندہ ہے جو نیاز کے فرش
زمین کو چھوڑ کر ناز کی فضا میں اُڑنے نہ لگے۔ عبدیت کی دنیا میں سنتے ہیں گریۂ یعقوبیؑ کے ساتھ
ساتھ ایک منزل تبسم سلیمانیؑ کی بھی تو آتی ہے۔

اقبال کے شکوہ میں، (شاعر اس وقت تک شاعر اسلام بن چکا تھا) بندہ اپنے خالق سے گویا
روٹھ کر کہتا ہے کہ واہ بیگانوں پر، باغیوں پر، سرکشوں پر تو لطف و نوازش کی یہ بارشیں اور ہم
اہل توحید کی یہ حالت زار۔ کیا یہی ہماری وفاکیشی کا صلہ ہے۔ یہی ہماری توحید پرستی کا انعام ہے۔

کونسی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی
اور تیرے لئے زحمت کش پیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی
کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی

لیکن "شکوہ" کا نام ہی شکوہ ہے۔ مضمون وہی حمد و مناجات کا اس لفافہ کے اندر بھی موجود ہے
طنز میں عبدیت کی چاشنی، ہر گلہ میں توحید پرستی کی شیرینی۔

اقبال کی اردو شاعری کی شہرت و عظمت کی اصل بنیاد یہی شکوہ ہے۔ خوب چلا، خوب پھیلا
کچھ بھی نہ سمجھے انھوں نے بھی مزے لے لے کر پڑھا اور جو مطلب الٹا سمجھے انہیں تو گویا اپنی آزاد

ـــ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۲۰ اپریل ۱۹۴۳ء کو وقت ۵ منٹ (بسلسلہ یوم اقبال)

خیالی کے لئے ایک سند و دستاویز ہاتھ آ گئی۔

حکیم ملت کہ ملت کا نباض تھا قوم کے رگ و ریشہ سے واقف تھا' بھانپ گیا۔ جو آبِ حیات کا قطرہ تھا وہ مثنویوں اور گلدستوں تک پہنچتے پہنچتے زہر کی بوند بن گیا۔ فوراً پلٹا اور شکوہ کے جواب میں "جواب شکوہ" کہہ ڈالا۔ جوش و خروش وہی زورِ بیان وہی۔ البتہ حقائق' زائد حقیقتوں کی کھلی ہوئی اور صداقتوں کا اظہار فاش و برملا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ وعدے تو مسلموں اور پرستارانِ توحید کے لئے تھے۔ تم مسلم اور موحد ہو کب؟ نظر قال پر نہیں اپنے حال پر کرو' اپنے اعمال پر کرو۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو	پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو؟
حیدری فقر ہے نے دولت عثمانی ہے	تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے

عوام اپنے جذبات کی ترجمانی "شکوہ" میں زیادہ پاتے ہیں اس لئے پست مذاق طبقہ آج تک شکوہ پسند ہی چلا آرہا ہے۔ حالانکہ "جواب شکوہ" کی سطح "شکوہ" سے کہیں بلند ہے۔ "شکوہ" والا اقبال ایک صاحب حال سالک ہے "جواب شکوہ" والا اقبال ایک صاحب مقام عارف ہے۔ پہلے کے قدم اقلیم قلب کی وادیوں میں' دوسرے کی نگاہ فضائے روح کی بلندیوں میں۔
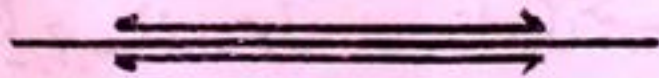
جنونِ الحاد

اقبال کے شکوہ و جواب شکوہ پر ایک ملحد کے تبصرہ کا اقتباس :-

"شکوہ میں شاعر نے مسلمانوں کی طرف سے خدا کو مخاطب کیا ہے اور گذشتہ اسلامی کارناموں کی یاد تازہ کردی ہے۔ جواب شکوہ میں خدا نے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے ان دونوں صورتوں میں وہ ساری ذہنیت کارفرما ہے جس کے زیر اثر کچھ قومیں اپنے خدا کی منتخب قوم تصور کرتی ہیں۔ ان نظموں کی فکریات سے اب دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ اقبال کی ان نظموں میں جنونِ مظلومیت کارفرما ہے۔ دنیا بھر کا ایک مذہبی اعتقاد اور دنیا بھر کی ایک مذہبی اہمیت بہت ضرر رساں خیالات ہیں۔ اقبال ایک مہذب اور متمدن دنیا کے SETTING میں اسلامی دنیا کو پیش نہ کرسکے۔"

(آواز - ۲۲ رجولائی ۱۹۷۳ء صدا)

مضمون کے اندر لفظ "جنون" (MANIA) خوب مل گیا۔ ایسے ہذیانات کے لئے عنوانِ تلاش کے بعد بھی اس سے بلیغ تر اور کون سا ہو سکتا تھا؟

اب پہلا سوال یہ ہے کہ اگر اسی کا نام "ادبی تنقید" ہے تو خدا معلوم مذہبی دخل درمعقولات کا اطلاق کس کس چیز پر ہوگا؟ ریڈیو والوں کو اصرار شد و مد کے ساتھ رہا ہے کہ اور جو کچھ بھی ہے لیکن مائیکرو فون کو مذہبی پروپگنڈے کے لئے بہرحال استعمال نہیں کیا جا سکتا لیکن اس دعوے کے اندر حقیقت صرف اتنی ہے کہ مذہب کی تائید و حمایت میں تو بے شک کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن

مذہب کی مخالفت میں ہر بکواس کی ہر ہرزہ سرائی کی اجازت ہے۔

پروپگنڈہ اگر مذہب کا جرم ہے تو لامذہبی والحاد کا اس سے بڑھ کر ہونا چاہیئے۔

پھر ارشاد ہوا کہ شکوہ اور جواب شکوہ دونوں میں وہ ساری ذہنیت کارفرما ہے جس کے زیر اثر کچھ قومیں اپنے کو خدا کی منتخب قوم تصور کرتی ہیں۔"

لیکن یہ قومی برتری ونسلی تفوق کا تخیل "سامی" ہے۔ تحقیق کی عدالت سے تو یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ تخیل خالص "آریائی" ہے" ہندی" ہے "برہمنی" ہے۔ حیرت ہے کہ ملحد نے اپنے وطن (دیش بھومی) کو چھوڑ کر عرب وشام تک جانے کی زحمت گوارا کیوں کی؟ ـــ اور پھر یہود کا حال جو کچھ بھی ہو، مسلمانوں نے "قومی تفوق" یا نسلی برتری کا دعویٰ کس دن کیا ہے؟ شکوہ جواب شکوہ دونوں کے کس شعر، کس مصرعہ، کس لفظ میں اس خیال کی ترجمانی ہے؟ اسلام تو اصلاً ہی اس کا منکر ہے کہ ذات پات قوم قبیلہ، نسل وخاندان کو معیار فضیلت قرار دیا جائے۔ قرآن وحدیث دونوں نے صرف اسی عقیدۂ جاہلی پہ بار بار لگائی ہے۔ اس کے لئے اس کی حوصلہ افزائی کس درجہ میں بھی، ممکن ہی کیونکر ہے؟ اس کی جانب ایسی بے حقیقت بات منسوب کرنا صرف اسی کا کام ہو سکتا ہے جو دین کی طرح دیانت سے بھی بے نیاز ہو چکا ہے۔ اسلام کا تو خود ہی یہ دعویٰ ہے کہ اصل چیز صحیح فکر ونظر ہے یعنی ایمان اور پھر صحیح عمل۔ اس کے سوا جو بھی معیار ہے باطل ہے۔ کیا دنیا، مہذب دنیا، سوشلسٹ دنیا، "فکریات" "IDEALOGY" اس سے بہت آگے جا چکی ہے۔ اس کے ٹھیک برعکس گھوم پھر کر ٹکرا کر اور تھک کر الٹی اسی مرکز کی طرف سمٹ سمٹا کر آرہی ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ اس پیکر عقل کو سرے سے فرق ہی ایک "مذہبی امت" (فکر وعقیدہ اختیاری کی بنا پر منظم ہونے والی جماعت) اور ایک قوم ونسل (محض محبت واتفاق سے پیدا کئے ہوئے غیر اختیاری نقطۂ وحدت کی بنیاد پر یکجا ہو جانے والے گروہ) کے درمیان نظر نہیں آتا؟
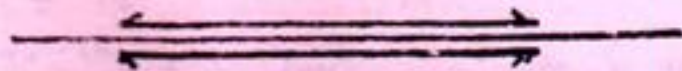
مغرب کی ترقی کا راز

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رُباب — نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست — نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی اُو را نہ از لادینی ست — نے فروغش از خطِ لاطینی ست
قوتِ افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است

اچھے بُرے کا سوال الگ ہے۔ لیکن نفسِ قوت، غلبہ و اقتدار تو بہرحال مغرب کو حاصل ہی ہے۔ حضرت اقبال فرماتے ہیں کہ قوت اسے کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟ کیا گانے بجانے سے؟ کیا بے حجاب عورتوں کے رقص سے؟ کیا عورت کے نیم عریاں لباس، یا کھُلے ہوئے بالوں کے فیشن سے؟ کیا اس کی لادینی حکومت سے؟ کیا لاطینی رسم الخط سے؟ اور پھر ان تمام ظاہری اور نمائشی چیزوں کی نفی کر کے فرماتے ہیں کہ

قوتِ افرنگ از علم و فن ست — از ہمیں آتش چراغش روشن ست

فرنگ نے جو قوت حاصل کی ہے اور جس کے زور سے وہ آج دنیا کو اپنے تابعِ فرمان کئے ہوئے ہے، وہ علوم و فنون کا ثمرہ ہے۔ اس کا چراغ جو سارے عالم کو روشن کئے ہوئے ہے وہ آخر علم و فن ہی کی آگ سے تو جل رہا ہے — تو حضرت اقبال کا فرمانا یہ ہے کہ ہم پر کیسا شامت سوار ہے کہ فرنگیوں سے ہم لیتے بھی ہیں تو صرف ان کی بے حیائی اور بے دینی اور دیگر

مطبوعہ صدق جدید - بابتہ ۱۰ ر فروری ۱۹۵۶ء

چھوڑے رہتے ہیں ان کی علمی ترقیوں اور ذہنی کاوشوں کو۔۔ صدہا ایجادات اور سینکڑوں انکشافات ہر سال ہوتے رہتے ہیں لیکن ان میں نام کسی مسلمان کا بھی نہیں آتا۔ نہ ہندوستان کے نہ پاکستان کے، نہ مصر کے، نہ ایران کے، نہ ترکی کے نہ انڈونیشیا کے! طبیعات، ریاضیات، ارضیات، نباتات، حیوانات، فلکیات، جغرافی تحقیقات، معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں سے کوئی واسطہ ہی ہم کو نہیں! کمال جب بھی حاصل کریں گے اور نام جب بھی پیدا کریں گے تو بس یا ناول نگاری میں یا فلم ایکٹری میں! حُبِّ دنیا کی اجازت اسلام یقیناً نہیں دیتا بلکہ اسے جرم ٹھیراتا ہے۔ لیکن آخر تسخیر قوائے کائنات سے کس نے ہم کو روکا ہے؟ برق و مقناطیس کے خواص و تاثرات کے علم سے کون باز رکھے ہوئے ہے؟ کیا تعلق مع اللہ و تبتل کے معنی حقائق تکوینی و طبعی کی طرف سے یکسر آنکھ بند کر لینے کے ہیں؟
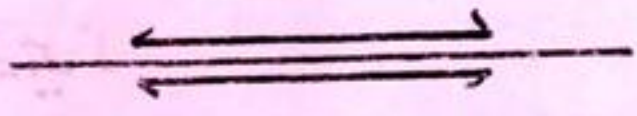
شیشہ اور موتی

اسی چودھویں صدی ہجری کا ایک محقق عالم، جس پر فلسفیت کے بعد نبوت کی حقیقت
ھی منکشف ہو چکی تھی، اپنے ہم عصروں کو سمجھاتا ہے ؎

فلسفی را از پیمبر وا شناس　　آبگینہ را ز گوہر وا شناس

فلسفی اور پیمبر کے درمیان، شیشہ اور موتی کے درمیان فرق کرنا سیکھو۔ شیشے کی جگمگاہٹ
ی قدر اسی وقت تک ہے جب تک ہیرے اور جواہر نظر سے نہیں گزرے ہیں۔ لعل و گوہر کی آب
تاب جس وقت تک آنکھوں کو خیرہ کرنے لگے گی، کانچ کا ٹکڑا خود ہی نگاہوں سے گر کر رہے گا

آبگینہ را ز پنداری بدست　　جز دمیکہ گوہرے آری بدست
چوں گہر آمد بدستت شبچراغ　　آبگینہ شد سیہ چوں پرِ زاغ

افلاطون و ارسطو ہوں یا ہل و اسپنسر، ان بیچاروں کی بساط تو بس اتنی ہی ہے کہ گویا کوئی
شخص ایک گہرے کنوئیں کے اندر پڑا ہو، وہاں سے زینہ لگا کر آفتاب تک اچک جانے کا منصوبہ
ندھتا ہے ممکن ہے سیڑھی کے دو چار دس پانچ ڈنڈے چڑھ جائے۔ لیکن نتیجہ؟ نتیجہ یہی کہ بس
پھر اوپر سے سر کے بل گرے گا اور اوندھے منہ کنوئیں کی تہہ میں جا پڑے گا۔

فلسفی اندر بُنِ چاہ نشستہ　　نردباں دارد بہ خورشید بلند
نردبانش می برد تا چند روش　　پس بچاہ افتد نگوں گشتہ سرش

مطبوعہ سچ، بابتہ ۲۵ نومبر ۱۹۳۲ء

ابراہیم خلیلؑ، موسیٰ کلیمؑ اور خاتمؑ الانبیا کا طریقہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ انھیں نیچے سے اوپر جانے کی فکر اور تدبیر کی ضرورت نہیں۔ ان کا مقام خود ہی بلند سے بلند تر ہوتا ہے، اور ان آسمانی بلندیوں سے وہ خود کمند پھینک پھینک کر دوسروں کو ان کی بلندیوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ جس نے ان کی کمند کو مضبوط پکڑ لیا بس وہ خوش نصیب بام آفتاب تک پہنچ گیا ؎

واں پیمبر خود ز بام آسمان — رشتۂ افگندہ سوئے خاکیاں
رشتۂ جاں را بدیں رشتہ بتاب — پس بر آ، تا بارگاہ آفتاب

علوی اور سفلی کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟ خاک اور عالم پاک ایک مرتبہ پر آ سکتے ہیں؟ پستی اور بلندی کا ایک درجہ ہو سکتا ہے؟ ؎

فلسفی از خاک پروازے دہد — ز آسماں پیغمبر آوازے دہد
واں بخواند خود ترا از کوئے جاں — ایں ز دوری رہ نماید سوئے خاں

روشنی اور تاریکی، زندگی اور ہلاکت، فلاح و نامرادی، دونوں کی راہیں ہمارے آپ کے سامنے کھلی ہوئی ہیں اور انتخاب میں آپ بالکل آزاد ہیں ۔ شاباش وہ جو سیدھی راہ پر پڑ لیے، حیف ان پر جو بھٹک کر رہ گئے ۔

▲ ▲ ▲

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

اقبالؔ کی ایک تازہ اور کسی قدر قدیم، دو فارسی مثنویوں کا مجموعہ ہے اور اقبال کے کلام
مدح و توصیف میں اب کچھ کہنا شاعر کی داد سے زیادہ خود اپنی سخن فہمی کا اعلان کرنا ہے
ر اپنی جوہر شناسی کا اشتہار دینا ہے۔ آفتاب کے روشن ہونے کی اگر آپ شہادت دے رہے ہیں
یہ ثبوت تو آفتاب کی روشنی سے بڑھکر خود آپ کی بصارت کے صحیح و تندرست ہونے کے
ں میں ہوا۔ حضرت رومی رح

مادحِ خورشید مداحِ خود است ... کیں دو چشم روشن و نامہ بدست

کتاب کا موضوع، عنوان سے ظاہر ــــ اور ایک ہی موضوع تو لے دے کے اب اقبال
پاس رہ گیا ہے۔ پرانے ہوتے پر ہمیشہ نیا! کثرتِ تکرار کے باوجود ہر دم تازہ و شگفتہ!
شق" گننے میں ایک، کیفیاتِ عشق ہر روز تجدید، لذاتِ عشق، ہر لحہ مزید!

زبان فارسی، لیکن اتنی سلیس کہ گویا اچھے پڑھے لکھوں کی اردو۔ کوئی ذرا سا بھی مشکل یا
نوس لفظ اگر آ گیا تو اس کا حل وہیں حاشیہ میں موجود شروع میں پڑھنے والے سے فرماتے ہیں کہ
ں وخرد نے حرم میں بغاوت برپا کر رکھی تھی میں اس کے لئے دیارِ عشق سے لشکر جرالے کر آ رہا
ں۔ یہ نہ سمجھنا کہ عقل کے لئے یوم الحساب ہے ہی نہیں۔

نگاہ بندۂ مومن قیامت فرداست!

تمہید کا آغاز جس نامِ نامی سے ہوتا ہے اس سے دنیائے عشق میں کون ناواقف ہے؟

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر　　کاروانِ عشق و مستی را امیر
نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش　　جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

ان کی روحانیت مکشوف ہو کر اقبال سے کہتی ہے ؂

جز تو اے دانائے اسرارِ فرنگ　　کس نکو ننشست در نارِ فرنگ
باش مانندِ خلیل اللہ مست　　ہر کہن بتخانہ را باید شکست
عصرِ تو از رمزِ جاں آگاہ نیست　　دینِ او جز حُبِّ غیر اللہ نیست
سرِ شبیری رانہ فہمد گاڈ میشن　　جز بہ شیراں کم بگو اسرارِ خویش
با حریفِ سفلہ نتواں خورد مے　　گرچہ باشد پادشاہ روم و رے
یوسفِ ما را اگر گرگے برد　　بہ کہ مردے ناکسے او را خرد
معنیٔ دین و سیاست باز گوئے　　اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گوئے

ساری مثنوی اسی پیام کی شرح و تفصیل میں ہے "حکمتِ کلیمی" و حکمتِ فرعونی کے بعد ایک عنوان لا الٰہ الا اللہ ہے۔ اس کے تحت میں فرماتے ہیں کہ لا جلال ہے۔ الا جمال، لا نفی، الّا ثبات، لا تبیینی، الا ہستی۔ سارا نظام کائنات انہیں دو حرفوں کی قوتِ عمل کا تماشہ گاہ ہے۔ ابتدا لا ہی سے کرنی چاہیئے اور غیر اللہ کے مقابلے میں وظیفۂ حیات اسی کو بنانا چاہیئے۔

ہر د و تقدیرِ جہانِ کاف و نون　　حرکت از لا زاید از الا سکون
در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست　　ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات　　تازہ از ہنگامۂ او کائنات

آگے ایامِ عرب، وغیرہ سے گزرتے ہوئے، "دورِ حاضر کے سرمایہ سوز" روس تک پہنچ جاتے ہیں اور ذرا دیکھئے کہ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں ؂

ہمچناں بینی کہ در دورِ فرنگ　　بندگی با خواجگی آید بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں　　از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ
فکر او در تند بادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے الا نراند

انجام جو ہونا ہے ظاہر ہے

آیدش روزے کہ از زورِ جنون — خویش را زیں تند باد آرد بروں

اس لئے کہ

در مقام لا نیاساید حیات — سوئے الا می خرامد کائنات

اقبال کے سردار و آقا نے تو یہ فرمایا تھا کہ کل روئے زمیں میرے لئے سجدہ گاہ ہے اور کہاں
آج دیکھنا پڑ رہا ہے کہ یہ مسجد اپنوں کی نہیں، بیگانوں کے قبضہ میں ہے ؎

مومناں را گفت آں سلطان دیں — مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں
الاماں از گردشِ نہ آسماں — مسجد مومن بدست دیگراں!

پیروں کا فقرہ، رہبانیت اور جوگ ہے، مومن کا فقر تو عین بادشاہی و حکمرانی ہے ؎

فقر قرآں احتساب ہست و بود — نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست؟ تسخیر جہات — بندہ از تاثیر او مولا صفات
فقرِ کافر، خلوتِ دشت و در است — فقر مومن لرزۂ بحر و بر است
فقرِ چوں عریاں شود زیر سپہر — از نہیب او بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیٔ بدر و حنین — فقرِ عریاں بانگ تکبیر حسین رضی

زمانہ نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اور عصر حاضر سے مقابلہ کے وقت ہم نے کیسی
جلدی ہی میں اپنی ہار مان لی ہے، اس کا ایک جلوہ اس آئینہ میں ملاحظہ ہو۔

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد — می شناسی عصر ما با ما چہ کرد!
عصر ما، ما را ز ما بیگانہ کرد — از جمال مصطفےٰ بیگانہ کرد
سوز او تا از میان سینہ رفت — جوہر آئینہ از آئینہ رفت
باطنِ ایں عصر را نشناختی — دادِ او دل خویش را در باختی

تہذیب فرنگ کی مصوری اقبال خدا جانے کتنی بار کر چکے ہیں، لیکن ہر نیا نقش اپنی دل آویزی میں پچھلے نقوش سے کچھ بڑھ کر ہی رہتا ہے۔ ایک طویل نظم کا عنوان وہی ہے جو کتاب کا ہے، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔ اس کے ذیل میں فرماتے ہیں ؎

آدمیت زار نالید از فرنگ — زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد — زیر گردوں رسم لادینی نہاد
گرگے اندر پوستین برۂ — ہر زماں اندر کمیں برّہ
دانش افرنگیاں تیغے بدوش — در ہلاکِ نوع انسان سخت کوش
آہ از افرنگ و از آئین او — آہ از اندیشۂ لادینِ او
علمِ حق را ساحری آموختند — ساحری نے، کافری آموختند!
اے کہ جاں را باز می دانی ز تن — سحرِ ایں تہذیب لادینی شکن

ردِّ بلا تو مومن کے ہاتھ میں ہے۔ مومن اگر اپنے ایمان پر جم جائے، اور اپنی خودداری پہ ثابت قدم رہ جائے تو سارا طلسم آناً فاناً ٹوٹ کر رہتا ہے۔

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ — تا کجا در قیدِ زنّارِ فرنگ
زخم از و نشتر از و سوزن ازو — ما و جوئے خون و امیدِ رفو
خود بدانی پادشاہی قاہری است — قاہری در عصرِ ما سوداگری است
تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج — از تجارت نفع و از شاہی خراج
کشتنِ بے حرب و ضرب آئینِ اوست — مرگہا در گردشِ ماشینِ اوست
بے نیاز از کارگاہ او گذر — در زمستاں پوستینِ او مخر
ہوشمندے از خم او مے نخورد — ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مُرد
وقت سود افتد قند و کم خروش — ما چو طفلانیم و او شکر فروش

اقتباسات بہت ہو گئے۔ جبر کر کے قلم روکنا پڑتا ہے ورنہ اگر طبیعت پہ چھوڑ دیا جائے تو شاید ساری کتاب ہی اول سے آخر تک نقل ہو کر رہے۔ "اللہ مست" مولا صفات "

"خودگداز" اور اسی قسم کی دوسری حسین ترکیبیں تو اقبال کا حصّہ ہو چکی ہیں اور ان پر کچھ کہنا تحصیل لاحاصل ہے۔

دوسری مثنوی "مسافر" کے نام سے ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں تھوڑی ہی تعداد میں نکلا تھا۔ اس لئے زیادہ پھیل نہ سکا۔ دنیا کے لئے کہنا چاہیئے کہ یہ مثنوی بھی نئی ہی ہے ۔ اقبال نادر شاہ شہید کی دعوت پر، مع مولانا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود، ۳۳ء میں کابل گئے تھے واپسی پر اپنے تاثرات اس مثنوی میں جمع کر دیئے ہیں، اور جو کچھ بھی کہنے کے قابل باتیں تھیں سب کہہ ڈالیں۔ نادر کون؟ مدح و وصف کے شعر بہت سے سنے ہوں گے، ذرا تعارف نامہ کا ایک شعر اقبال کی زبان سے سنیئے ؎

خسروی شمشیر و درویشی نگہ ہر دو گوہر از محیطِ لاالٰہ

اسی سفر میں اقبال شہنشاہ بابر کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں اور کیسے رنگ و بو کا گلِ عقیدت مزار پر چڑھاتے ہیں ۔

خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرمید این جا کہ ایں زمیں زطلسمِ فرنگ آزادست

غزنی میں حکیم سنائیؒ کی قبر پر جا کر مراقب ہوتے ہیں اور بہشت بریں سے صدا سنتے ہیں ؎

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

مزار سلطان محمود پر جو گزری، دیرانہ غزنی میں مناجات پڑھنے والے نے کیا دیکھا اور کیا سنا اور کیا کہا اور اس قسم کے سارے دلکش منظر کے لئے تو اصل کتاب کو ملاحظہ فرمایئے اور آخر میں صرف اتنا اور سن لیجیئے کہ اقبال کو شاہ شہید کی اقتدا میں نماز عصر پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ آہ! کہاں وہ ایک نماز شاہ اسلام کے پیچھے اور کہاں دوسری صدہا نمازیں! شاعر اگر ان مقامات کی شرح کرنا چاہیئے بھی تو بیان پر قدرت کہاں لا سکتا ہے۔ مجبوراً بس اتنی سی کسک دل میں پیدا کر کے رہ جاتا ہے ؎

رازہائے آں قیام وآں سجود جز ببزمِ محرماں نتواں کشود!

▲ ▲ ▲

"ضربِ کلیم"

اقبال، مسلمانوں کی قوم کے کلیم، اقبال کا سن جوں جوں پختگی کی طرف بڑھتا جاتا ہے، حکمت و شاعری پختہ سے پختہ تر ہوتی جارہی ہے ــــ خام تو کبھی بھی نہ تھی۔ شاعری سے مراد رسمی غزل گوئی اور قافیہ پیمائی نہیں۔ مراد وہ شاعری ہے جو رومیؒ کی تھی سنائیؒ کی تھی وہ شاعری نہیں جو حق سے ہٹاتی، بھٹکاتی ہے۔ وہ شاعری ہے جو حق کی طرف بلاتی، لاتی ہے۔

اقبال کا پیام ساری دنیا کے لئے ہے، دنیائے اسلام کے لئے خصوصاً۔ قرآن کی بھی مخاطب ساری نوع انسانی ہے لیکن حقیقتہً فائدہ اٹھانے والے صرف مومنین ہیں۔ اقبال اپنا دردِ دل سنانا تو سب ہی کو چاہتے ہیں، جو پہلے اقبال کے خدا کی؟ اقبال کے رسولؐ کی سُن چکے ہیں۔ ان فی ذالک لذکری لمن کان لہ قلبٌ او القی السمع وھو شہید۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کچھ فارسی میں کہہ چکے ہیں بہت کچھ اردو میں کہہ رہے ہیں۔ تازہ ترین افادہ کا نام "ضربِ کلیم" ہے۔ زبان اردو، ضخامت ۱۸۲ صفحات۔ طباعت صاف و روشن، قیمت درج نہیں۔ جو کچھ بھی ہو ــــ بہرحال کتاب کی معنویت کے اعتبار سے کمتر ہی ہوگی ــ عصائے موسیٰؑ کی قیمت کا اندازہ کوئی صاحب یوں بھی فرمائیں گے کہ اتنے فٹ لمبی اور اتنے انچ موٹی۔ جنگل کی لکڑی کا مول تول بازار میں کیا ہے۔ ملنے کا پتہ "طلوع اسلام" میکلوڈ روڈ، لاہور۔ بعض صحابہؓ نے دریافت کیا کہ امت میں کس زمانہ کے لوگ بہتر ہوں گے۔ جواب میں سرورِ سرداراںؐ کی زبان سے ارشاد ہو کہ میری

امت کی مثال نو بارش کے قطروں کی سی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اگلے قطرے بہتر ہے یا پچھلے۔ اقبال کا کلام بھی مسلسل بارانِ رحمت سے کم نہیں۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ بہتر کسے کہیئے اور کسے نہ کہیئے اور اگر کسی کو اعلیٰ و بلند ٹھہرا بھی لیجئے تو اس کے مقابل میں آخر ادنیٰ و پست کسے ٹھہرائیے؟ جب کلام سامنے آگیا دل نے کہا یہی خوب اور خوب تر ہے۔ جب کسی دوسرے کلام پر نظر پڑی تو اب تو وہ فیصلہ مقلوب، نگاہِ انتخاب حیران! یہ اور بات ہے کہ انتخاب کی حیثیتیں ہی شروع سے مختلف ٹھہرا لیجئے اور اسی لحاظ سے فیصلہ کر دیجئے کہ شوخی و برجستگی فلاں میں زیادہ ہے، عمق میں فلاں بڑھا ہوا ہے، درد و گداز میں فلاں کا نمبر اول ہے۔ وقس علیٰ ہٰذا۔

ضربِ کلیم کا وصف امتیازی، حکیمانہ ژرف نگاہی ہے۔ ہر عنوان دقتِ نظر کا ایک مرقع ہر صفحہ نکتہ سنجیوں کا ایک گلدستہ، بات وہی ایک ساڑھے تیرہ سو برس کی پرانی بلکہ اس سے بھی ہزاروں سال قبل کی بات کہنے کے ڈھنگ نئے نئے اور عنوانات جدا جدا۔ بات میں کشش ایک تو ہر فطرتِ سلیم والے کے لئے ذاتی موجود اور پھر کہنے والے کی زبان میں موہنی۔ کتاب قدرۃً دلچسپ اسی قدر ہوگی کہ ایک بار شروع کر کے ختم کرنے کو جی نہ چاہے، اور پڑھتے پڑھتے جب آخری صفحہ پر پہنچے تو دل میں حسرت ہی رہ جائے کہ محفل برخاست اتنی جلدی کیوں ہو گئی! وہی روئے گل کے سیر ہو کر نہ دیکھنے اور موسمِ بہار کے ختم ہو جانے کا پرانا دکھڑا۔

گھر کے بھید، گھر کے بھیدی سے بڑھ کر کس کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔ بتکدۂ آذر پر تیشۂ ابراہیمی سے بڑھ کر کس کی ضرب پڑ سکتی ہے۔ طلسمِ افرنگ کو توڑنے کے لئے افسون خوان اقبال سے بڑھ کر کون ملے گا۔ اسی طلسم کدہ کا پروردہ اسی میکدہ کا سرشار ؎

مدتے محو تگ و دو بودہ ام	رازدانِ دانشِ نو بودہ ام
باغباناں امتحانم کردہ اند	محرم ایں گلستانم کردہ اند
مدتے بالالہ رویاں ساختم	عشق بامرغولہ مویاں باختم

کوئی صفحہ کہیں سے کھول لیجئے، ایک ہی چمن کی گلکاریاں نظر آئیں گی۔ قوت اگر بے دینوں کے ہاتھ میں ہے تو دنیا کے نمونۂ جہنم بنا دینے کے لئے کافی۔ وہی قوت اگر حق پرستوں کے ہاتھ

یہی ہے تو عصبیت کی رہبر ہے

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک

اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر — ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

ص ۲۲

تنسیخ جدید کا فتویٰ کہ اب جہاد بالسیف کو منسوخ سمجھو اب تو صرف قلم کافی ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ جہاد سیفی کی منسوخی کے اعلان کا بھلا اس وقت کے مسلمانوں کے سامنے کیا محل ہے!

تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں — ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بےخبر

ص ۲۲

اور ہاں یہ ــــ دل پکڑ لیجیے

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل — کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر

اب تو

تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی — دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے — یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

اب دوسرے مصرعہ "یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر" کو مکرر پڑھے بغیر، اس سے لطف لئے بغیر آگے بڑھ جانا ہی ظلم ہے۔ ظلم شاعر پر نہیں خود پڑھنے والے کے ذوقِ سلیم پر

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے — مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات — اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگذر!

جس لفظی طلسم بندی کا نام یونان نے کبھی اور یورپ نے آج بھی فلسفہ رکھا ہے، کہتے ہیں کہ وہ نوجوانوں کے دلوں میں مذہب کی بنیادیں ہلا ڈالتا ہے اس کی حقیقت کوئی اس کے دل سے پوچھے جو خود ان گلیوں کی خوب خاک چھانے پڑا ہو۔ شاعر آج بھی چند سال ادھر تو آخر جوان تھا اور انہیں ڈگریوں اور امتحانوں اور پروفیسروں کی بھول بھلیاں میں ٹھوکریں کھا چکا ہے ؎

معلوم نہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہگذر سے
الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

ص ۳۷

ہنگامہ برپا ہے کہ مسلمان زمانہ کا ساتھ نہیں دیتے اس لئے برباد ہوئے جاتے ہیں، مٹے جاتے ہیں حکیم امت کہتا ہے کہ نادانوں ذرا حواس درست کر کے زبان کھولو، مومن کو تم نے پہچانا کیا ہے۔ زمانہ کے آگے سجدۂ پرستش میں گر پڑنا یہ کافروں کا شعار ہے۔ مومن کا کام زمانہ کے ساتھ جینا نہیں اسے اپنے ساتھ چلانا ہے، زمانہ کا محکوم بننے کے لئے نہیں، اسی پر حاکم بننے کے لئے آیا ہے

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں ہے گم مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

مومن کو فرش خاک کے بسنے والے خاک کے پتلوں نے پہچانا کہاں؟

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
بچتے نہیں کنجشک د ہما اس کی نظر میں جبرئیل و سرافیل کا صیاد ہے مومن
کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

رہا تمدن اسلامی، سو اس کی حقیقت ہر قسم کی جوگیانہ زندگی اور ص ۱۲۱ ہر قسم کے بادشاہانہ تعیش دونوں سے کہیں مختلف اور بالاتر ہے ؎

نہ اس میں عصر رواں کی حیا سے بیزاری نہ اس میں عہد کہن کے فسانہ و افسوں

یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال ؛ عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں

غلامی کی حالت میں گرفتار رہ کر، غلامی پر قانع رہ کر نبوت کی تبلیغ بھی ایک عجیب لطیفہ ہے صاحب الہام، اگر خود آزاد ہے تو دیکھتے دیکھتے انقلاب پیدا کر دیتا ہے ؎

اس مرد خود آگاہ خدا مست کی صحبت دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے غارتگر اقوام ہے وہ صورت چنگیز!

ص ۵۹

اب "خود آگاہ" اور "خدا مست" کی ترکیبیں کہیں حکیم مومن خاں دہلوی کے قلم سے نکل گئی ہوتیں تو آج ان کی شہرت میں ان کی نیک نامی میں ان کے کمال فن میں اور چار چاند لگ گئے ہوتے۔ اقبال غریب پنجابی اور سیالکوٹی ہو کر ایسی قسمت کہاں لاسکتا ہے۔ یہی ترکیبیں آج خدا جانے کیسے کیسے نقادانِ فن کو ہفتوں اور مہینوں دعوتِ تمسخر دیتی رہیں گی۔

محمد علی رح کہا کرتے تھے خدا نے تو انسان کو پیدا کیا تھا یہ حضرتِ انسان ہیں جنھوں نے اقوام کو پیدا کر لیا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ بصیرت ہو تو سوچو، کہاں مکہ کا پیغام اور کہاں جینوا کا اقدام ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریقِ ملل حکمت افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکہ نے دیا خاک جینوا کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

اکبر مرحوم فرمایا کرتے تھے "بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو اطاعت و پابندی تو بڑے سے بڑے ملحد، بڑے سے بڑے منکر کو بھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر اس دنیا میں ایک لمحہ ایک آن کیلئے بھی چارہ نہیں۔ سوال صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ پابندی کس کی کرنی منظور ہے؟ احکام شرعی کی یا احکام تکوینی کی؟ پابندی تقدیر کہ پابندی احکام؟ ترجمانِ حقیقت کی زبان سے سنیئے اور داد دل ہی دل میں جتنی دیر تک چاہیے دیتے رہیے ؎

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر — ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

(ص ۶۲)

اپنے ہاں اسکولوں میں کالجوں میں، یونیورسٹیوں میں جس قسم کے نصاب رائج ہیں جو جذبات ان درس گاہوں میں پیدا کئے جاتے ہیں "اعلیٰ تعلیم" کے نام سے جس قسم کا تصور ذہنوں میں جمایا گیا ہے ان سب کا جائزہ لے کر اقبال کی حقیقت نگاری پر نظر کیجیئے ؎

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی — موسیقی و صورت گری و علم نباتات

تہذیب جدید کا ایک خاص مظہر رقص ہے۔ رقص آپ کے ہاں "ارباب نشاط" والا نہیں، مردانہ وزنانہ طائفوں والا نہیں، بھانڈوں اور بیسواؤں والا نہیں بلکہ وہ ناچ جس میں "صاحب" اور "میم صاحب" مل کر غیروں کے جسم سے جسم ملا ملا کر اور میم صاحب نیم برہنہ طرح طرح تھرکتے ہیں مٹکتے ہیں جب تھکنے لگتے ہیں تو چھلکتے ہوئے جام سے تازہ دم ہو جاتے ہیں اقبال اس منظر کو دیکھ کر اپنے ہم قوموں سے کہتے ہیں ؎

چھوڑ یورپ کیلئے رقصِ بدن کے خم و پیچ — روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللہی
صلہ اُس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن — صلہ اِس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

ص ۱۳۵

اکبر نے کہا تھا کہ اگلوں کی تلوار تو جسم ہی کاٹ کر رہتی ہے۔ کمال جدید حربۂ تعلیم کا ہے، کہ قالب وہی رہے اور روح کچھ سے کچھ ہو جائے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اقبال نے اسی راز کو ایک لارڈ صاحب (لارڈ) کی زبان سے نقل کیا ہے۔

ایک لرڈِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُدھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر ص ۱۵۶

اقبال کو آپ نے اپنوں کی زبان سے یہ بارہا سنا ہوگا کہ ایک سرکاری آدمی ہیں، عہدہ کے حریص خطاب کے بھوکے اب ذرا اس حکومت کے آدمی کی زبان سے" ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" سنیئے۔

لاکر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں — زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا — روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات — اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو ▲▲▲

دانشِ حاضر

دانش حاضر حجاب اکبر ست ۔۔۔ بت پرست و بت فروش و بت گر ست

" دانش حاضر" جس کا نام آپ نے فرطِ تعظیم و غایت تکریم سے " علوم جدیدہ" رکھا ہے اور جس کے اندر " سلطنے سائنس" اور " رسائے آرٹ" شامل ہیں، اس کی بابت کہنے والا کہتا ہے کہ ان سرتاپا تصنع " علوم" و " فنون" سے بڑھ کر علم حق پر پردہ ڈالنے والا کوئی نہیں، مگر خود یہ کہنے والا کون ہے؟ کوئی مسجد کے حجرہ کے اندر بند رہنے والا کٹھ ملا نہیں، خانقاہ کے اندر چھپ کر رہنے والا صوفی نہیں، کالجوں کے سایہ میں پلا ہوا، یونیورسٹیوں کی گودوں میں کھیلا ہوا، فرنگیوں کی علم و حکمت کی انتہائی سندیں، ڈگریاں پائے ہوئے، بیسویں صدی کا زندہ حکیم و زندہ شاعر اقبال ہے۔ جو خود اپنے متعلق کہتا ہے اور حرف بہ حرف سچ کہتا ہے ؎

مدتے محو تگ و دو بودہ ام ۔۔۔ رازدانِ دانش نو بودہ ام
باغباناں امتحانم کردہ اند ۔۔۔ محرم ایں گلستانم کردہ اند
گلستانے لالہ زارے عبرتے ۔۔۔ چوں گل کاغذ سرابِ نکہتے
تا ز بند ایں گلستاں رستہ ۔۔۔ آشیاں بر شاخِ طوبیٰ بستہ ام

جرمنی اور برطانیہ کی اونچی اونچی یونیورسٹیوں اور نامی نامی اکاڈمیوں کے تجربہ کے بعد ہار اور تھک کر، فرنگی حکمیات اور معقولات کا یہ استاد اپنے مسلم بھائیوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

لہ سچی باتیں، مطبوعہ صدق ۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۹ء

علم حق را در فنا انداختی | بہر نانے نقد دیں در باختی
گرم رَو در جستجوئے سرمۂ | واقف از چشم سیاہ خود نۂ

بی اے کی سند کے پیچھے، ایم اے کی ڈگری کی خاطر، ڈاکٹر کہلانے کے لئے "اپنے مقالہ THESIS
قابلِ قبول بنانے کے لئے، نافہموں کی داد لینے کے لئے، فرنگیوں کی واہ واہ سننے کے لئے، پرنسپلی
لئے، ہیڈ ماسٹری کیلئے، ڈپٹی کلکٹری کیلئے، جسٹری کیلئے، خاں بہادری کیلئے، کونسل اور اسمبلی
ممبری کیلئے، ہائیکورٹ کی ججی کیلئے، وزارت کے لئے، ایگزیکٹو کونسل کی ممبری کے لئے۔ اے نادان
بدنصیب مسلم، دیکھ تو، تُو نے کتنی بڑی نعمت کا کفران کر ڈالا! علم حق جیسی دولتِ بے بہا کیسی پس
ت ڈال دی! چند روپیوں کے لئے، یا چند سو، یا چند ہزار کے لئے، لالچ میں آکر لازوال اور
ی دولت سے دست بردار ہو گیا! اور ہیرے جواہرات کو چھوڑ کر، تانبے کے پلیسوں بلکہ کوڑیوں
ـ پر جھک پڑا!

سوزِ دل، سکونِ خاطر، عرفانِ حق کو بھلا ان ڈگریوں اور ڈپلوموں، ان امتحانوں اور ان
روں، ان تنخواہوں اور ان عہدوں، ان منصوبوں اور ان خطابوں سے بھلا کوئی دور کا بھی
سطہ ہے؟

آبِ حیواں از دمِ خنجر طلب | از دہانِ اژدہا کوثر طلب
سنگِ اسود از درِ بتخانہ خواہ | نافۂ مشک از سگِ دیوانہ خواہ
سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوئے | کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے

ہر محال سے محال کی توقع کی جا سکتی ہے، ہر ناممکن چیز فرض کی جا سکتی ہے۔ لیکن "علوم جدیدہ"
ے تشفیٔ قلب کی، عرفانِ حق کی توقع رکھنا، ان سب سے محال تر، ان سب سے ناممکن تر ہے!

جاوید نامہ

خالق کی "سب سے زیادہ تعریف کرنے والے" کا نام صدیقوں اور نورانیوں نے ہمیشہ جن جن القاب کے ساتھ لیا، وہ ہم اور آپ بارہا سُن چکے ہیں، مخلوق کے سب سے زیادہ تعریف کئے گئے کا ذکر شہیدوں اور ولیوں کی زبان پر جس جس طریقہ پر آیا، اس سے بھی خوب واقفیت ہو چکی ہے لیکن یہ بھی کچھ خبر ہے کہ اُس "احمد" اور "محمد" کے وقت اور زمانہ کے دقت اور زمانہ کے صدیق نہیں زندیق اور نورانی نہیں ظلماتی اُسے دیکھ دیکھ کیا کہتے تھے اور اسی کے جلوہ میں حق کی تائیدیں اور نصرتیں، ہر دم دیکھ دیکھ، آخر اپنے دل کی جلن اور کلیجہ کی پھنکن کیا کہہ کہہ کر ٹھنڈی کرتے تھے؟ زمانہ کا سب سے بڑا "روشن خیال" اور جمہوریۂ قریش کا سب سے بڑا لیڈر ابوجہل کہا جاتا ہے اور خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر شاید غلافِ کعبہ کو تھام کر یوں صدائے "احتجاج" بلند کرتا ہے ؎

سینۂ ما از محمد داغ داغ — از دمِ او کعبہ را اشد گل چراغ

از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود — نوجواناں را ز دستِ ما ربود

ساحر و اندر کلامش ساحری است — ایں دو حرفِ لاالٰہ خود کافری است

تا بساطِ دینِ آبادر نوردد — با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد!

پاش پاش از ضربتش لاتؑ منات | انتقام از وے بگیر اے کائنات
دل بغائب بست داز حاضر گسست | نقشِ حاضر را فسون او شکست
دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست | آنچہ اندر دیدہ می نایدکجاست!
خم شدن پیشِ خدائے بے جہات! | بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوات!

اس محمدؐ کی تحریک نے ہمارے دلوں کو چھلنی کر ڈالا ہے۔ ہمارے کعبہ کی رونق اس
تے غائب کر دی! قیصر وکسریٰ کے مٹانے کے خواب دکھا دکھا کر، ہائے خود ہمارے نوجوانوں
کو ہم سے چھین لیا! کیا زبردست ساحر ہے! اور کلام تو سرتاپا سحر! اب اس سے بڑھ کر کفر
صریح اور کیا ہو گا کہ دین کا کلمہ ہی لآ الٰہ اِلّا اللہ قرار دیا ہے! جس دین کو ہمارے باپ
دادا ہمیشہ سے مانتے چلے آئے اسی کو جھٹلا کر رکھ دیا ہے اور ہمارے معبودوں کی توہین کی
وحد کر دی، ہمارے "لات" ہمارے "منات" کسی کو بھی تو نہیں چھوڑا! اور یہ اندھیر کہ اب بھی
اس سے انتقام نہیں لیا جاتا! پھر یہ عقیدہ بھی تو ملاحظہ ہو کہ "آج" کو چھوڑ "کل" کو پکڑو۔
حاضر" کچھ نہیں "غیب" ہی سب کچھ، نقد کو چھوڑ، "وعدہ" کے پیچھے دوڑنا، محسوسات کو چھوڑ
ایک عالم غیب کے چکر میں پڑے رہنا، یہ آخر کہاں کی عقل ہے؟ جن معبودوں کو ہمیشہ ہم نے
وجا ہماری STATE نے پوجا، انہیں چھوڑ چھاڑ، ایک ان دیکھے خدا کے آگے سر جھکانے
کے آخر معنی کیا؟ معصوم کی فردِ جرم کے عنوانات (نعوذ باللہ) اس موذی کی زبان سے ابھی
کہاں ختم ہوئے آگے اور سنیے:۔

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب | از قریش و منکر از فضلِ عرب!
در نگاہِ او یکے بالا و پست | با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ | با کلفتانِ حبش در ساختہ
ایں مساوات ایں مواخا عجمی است | خوب می دانم کہ سلماں مزدکی ست!
ابنِ عبد اللہ فریبش خوردہ است | رستخیزے بر عرب آوردہ است!
چشمِ خاصانِ عرب گردیدہ کور | بر نیائی اے زہیر از خاکِ گور

اے تو مارا اندریں صحرا دلیل | بشکن افسونِ نوائے جبرئیل!
اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر | خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر
اے منات اے لات ازیں منزل مرو | گر ز منزل می روی از دل مرو

اس کا مذہب غضب ہے غضب کہ ملک و زمین کی پروا کرتا ہے نہ خاندان و نسب کی کہاں کی قومی عصبیت اور قومیت، یہ تو عرب اور غیر عرب قریش و غیر قریش سب کو ایک سطح پر کئے ڈالتا ہے اندھیر ہے اندھیر کہ مساوات کا نام لے کر غلام و آقا کو ایک دستر خوان پر بٹھائے رہتا ہے، ہائے دل کو کیسے صبر آئے عرب کی بے عزتی ہو اور حبشہ کے کالے کلوٹوں کی عزت و قدر، یہ "مساوات" یہ "مواخات" ہمارے ہاں تھی کب؟ یہ سب اس سلمان فارسی کی لائی اور سکھائی ہوئی ہے۔ ہمارا بھتیجہ ابن عبداللہ اس منزدکی کے کہے سنے میں آکر، آہ کیا اپنے ملک و ملت کا دشمن ہو گیا ہے! اچھے اچھے اشرافِ عرب اس کے فسوں میں آکر بہک چلے، اے زہیر، اے سحبان، اے امراء القیس، تم کہاں ہو اپنی قوم کی بربادی دیکھ رہے ہو اور پھر اپنی قبروں سے باہر نکل کر نہیں آتے؟ جبرئیل کے لائے ہوئے پیام کا اس کے پھیلائے ہوئے جادو کا توڑ اگر ہے تو تمہاری فصاحت و بلاغت میں، تمہاری ہی سحر کاری اور شاعری میں! اے اچھے اور بڑے دیوتا ہبل نہیں کیا ہو گیا۔ اپنے پجاریوں کی تم بھی خبر نہیں لیتے، بے دینوں کو آخر کب تک مہلت دیئے جاؤ گے؟ اے پیاری دیویو! لات و منات کہیں یہ غضب نہ کرنا کہ ہم سے روٹھ کر چلی جاؤ اور خیر اگر جانا ہے تو نہیں تمہارا ہی واسطہ کہیں ہمارے دل کی آبادیوں کو اپنی یاد سے ویران نہ کر دینا۔

شاعر کی آواز الہام کی آواز ہوتی ہے ہاں ہر شاعر کی نہیں، اس شاعر کی نہیں جو بے بصری کے ساتھ تخیل کی ہر وادی میں ٹھوکریں کھاتا اور اپنا سر ٹکراتا پھرتا ہے بلکہ اس شاعری کی جو ایمان کی روشنی میں بصیرت کی شعاعوں میں وانتصروا من بعد ما ظلموا کے

سایۂ رحمت میں، حقیقت کی منزلیں طے کرتا ہوتا ہے۔ اقبالؔ، قوم میں اسی قسم کا شاعر ہے اقبالؔ
کے نام سے خیال مسلم کانفرنس اور گول میز کانفرنس اور سیاسیات کی طرف نہ جائے۔ یہاں ذکر
سیاسی اقبالؔ کا نہیں اقبال شاعر کا ہے۔ اس اقبال کا ہے جس نے "قومی ترانہ" گایا امت کا "شکوہ"
اپنے رب کو سنایا "اسرار خودی" کی تشریح کی "رموز بیخودی" کو بے نقاب کیا اور مغرب زدوں
تک "پیام مشرق" پہنچایا اور اب اپنی روئیداد دل کو "جاوید نامہ" کے نام سے پیش کرنے اٹھا ہے
یہ نئے طرز کی نعت، اسی اقبال کی زبان سے ابھی آپ نے سنی۔ نعت ایسی انوکھی نعت
کبھوں کسی نے کہی ہوگی، لفظاً ہجو اور معناً نعت ہی نعت! ایسی نعت کی سند اگر ملتی ہے تو بندو
سے گزر کے، خود اللہ کے کلام میں، نوح اور ابراہیمؑ، لوطؑ اور صالحؑ، شعیبؑ، اور یونسؑ،
موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور سب سے بڑھ کر خاتم الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ظالموں
اور طاغیوں نے جو گستاخیاں کیں، قرآن پاک نے آخر انھیں نقل ہی کر کے محفوظ کر دیا۔ یہ سب
انبیائے کرام کی نعت نہیں تو اور کیا ہے؟ خفاش (چمگادڑ) اگر شور مچا مچا کر کہے کہ یہ دن
ایسا تیرہ و تار ہے مجھے ذرا بھی نہیں سجھائی دیتا تو یہ انسانوں کیلئے دلیل اس کی ہوتی کہ دن
تاریک نہیں خوب روشن ہے۔ اشقیا اگر جی بھر بھر کر کوسیں تو یہ اس کی ہجو نہیں اس کی
مدح ہوتی۔ پیکر ظلمت وضلالت کی زبان سے، چشمۂ نور ہدیٰ کے لئے سب و شتم نعت کی وہ
لطیف قسم ہے کہ دوسروں کا ذہن بھی یہاں تک پہنچنا مشکل ہی تھا۔

جاوید نامہ کی زبان فارسی ہے، عارف رومی کی زبان اور بہت سے دوسرے
ارمان۔ اسرار کی زبان، خود ایک مثنوی ہے، جا بجا غزلیات سے آراستہ خاکہ مثنوی یہ ہے کہ
شاعر، شہر کے ہجوم و ہنگامہ سے گھبرا کر دریا کے کنارے چلا گیا ہے تنہائی میں ایک روز سر
امام رومیؔ کی یہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزو است
بنمائے رُخ کہ باغ و گلستانم آرزو است

گنا رہا تھا کہ مولانا کی روحانیت دفعۃً منکشف ہوئی اس روح کا مادی سراپا بھی ملاحظہ ہو جائے

طلعتش رخشندہ مثل آفتاب
شیب او فرخندہ چوں عہد شباب

طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب — شیبِ او فرخندہ چوں عہدِ شباب

پیکرے روشن ز نورِ سرمدی — در سراپایش سرورِ سرمدی!

بر لبِ او سرِ پنہانِ وجود — بندہائے حرف و صوت از خود کشود

حرفِ او آئینہ آویختہ — علم با سوزِ دروں آمیختہ!

ایسا موقع مل کر کہاں ہاتھ سے دیا جا سکتا تھا۔ گفت و شنود، سوال و جواب سب لئے ہوئے اب فرشتہ زروان متمثل ہوتا ہے۔ جو روحِ زمان و مکاں ہے اور اس کی رہنمائی میں شاعر عالمِ ملکوت کی سیاحت کو روانہ ہوتا ہے۔ پیرِ رومی قدم قدم پر دستگیری کو موجود، اس عالم میں شاعر کی نظر سے جو جو منظر گزرتے ہیں ان کی وہ فوری عکسی تصویر SNAPSHOT لیتا جاتا ہے اور انہیں منظروں کو وہ دوسروں کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اعلیٰ علیین اور اسفل السافلین دونوں کی تجلیات جمالی و قہری کی جلوہ گاہ دونوں کی حیاتِ ابدی ایک سرے پر موسیٰ کلیم، دوسرے پر فرعون، حیاتِ جاودانی کے حصہ دار دونوں اپنے اپنے رنگ میں! مرقع کو شاعر جاوید نامہ کہہ کر نہ پکارتا تو اور کیا کہتا؟

نوحۂ "ابوجہل" ابھی آپ سن چکے۔ اب ذرا نالۂ فرعون بھی، عبرت کے کانوں سے سنتے چلیئے فرعون جہاں ہے اس مقام کی ویرانی کا کیا پوچھنا ہے

کوہ ہائے خشتہ و عریاں سرد — اندراں سرگشتہ و حیراں دو مرد!

وہ مقام ہے ہی مخصوص زور آوروں، منکروں گردن کشوں، غیب کے منکر والا و حواس پرستوں کے لئے۔ مولانا کی روحانیت ساتھ ساتھ ہے پتہ بتاتی ہے کہ

ایں مقامِ سرکشانِ زور مست — منکرانِ غائب و حاضر پرست!

لیکن فرعون یہاں تنہا نہیں ہے، ایک دوسرا فرعونِ وقت بھی اس پچھلے فرعون کے ہم نشین و ہم پہلو ہے وہ فرعون مصری ہزارہا سال قبل کا تھا، یہ فرعون اسی بیسویں صدی کا ہے۔ ملک "مصر" کا اور "دریا" کا، تعلق دونوں سے ایک شرقی ایک غربی۔ ایک پیمبر کے مقابلے میں اکڑنے والا دوسرا ایک درویش کو ستانے والا عدو اللہ دونوں کے

دونوں۔ انجام کے عبرت انگیز ہونے کے لحاظ سے دونوں ایک۔ انتہائی ساز و سامان کے باوجود دریا میں ڈوب کر ہلاک ہونے والے دونوں!

آں یکے از شرق و آں دیگر ز غرب	ہر دو با مردانِ حق در حرب و ضرب!
آں یکے بر گردنش چوبِ کلیم	واں دگر از تیغ درویشے دو نیم!
ہر دو فرعون، ایں صغیر و آں کبیر	ہر دو در آغوشِ دریا تشنہ میر!
ہر کسے با تلخیٔ مرگ آشناست	مرگِ جباراں ز آیاتِ خداست!

مولانا کی نورانیت سے فضا کی تیرگی وقتی طور پہ منور ہو جاتی ہے اور ظلمات کا سردار حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ اس ظلمت کدہ میں یہ روشنی کی شعاعیں کہاں سے!

گفت فرعون، ایں سحر، ایں جوئے نور!	از کجا ایں صبح و ایں نور ظہور!

مولانا فرماتے ہیں اے ید بیضا کے منکر، آج تو اس نور کا اقرار کرنا پڑا فرعونِ بے سامان کی آہ و زاری اُن کے سننے کے قابل ہے جو آج فرعونِ باسامان بنے ہوئے ہیں ؎

آہ نقدِ عقل و دیں در باختم	دیدم و ایں نور را نشناختم
اے جہانداراں سوئے من بنگرید	اے زیاں کاراں سوئے من بنگرید
وائے قومے از ہوس گر دیدہ کور	می برد لعل و گہر از خاکِ گور
پیکرے کو در عجائب خانہ ایست	بر لبِ خاموشِ او افسانہ ایست
از ملوکیت خبر ہا میدہد	کور چشماں را نظر ہا میدہد

ہائے افسوس کہ میں زندگی بھر عقل اور دین دونوں سے محروم رہا، ہیہات کہ آنکھوں کے سامنے روشنی رہی اور مجھ بد بخت نے اُسے نہ دیکھا۔ دنیا کے تاجدارو! نشۂ سلطنت کے متوالو، میری مثال سے عبرت حاصل کرو نصیحت پکڑو، عبرت، عبرت کہ اب دنیا میں ایسی قوم پیدا ہوئی ہے۔ حرص و ہوس میں اندھا دھند غرق جو دولت بٹورنے کی دھن میں مقبروں تک کو کھود ڈالتی ہے اور مدفون سلاطین کی لاشوں سے لال و جواہر اتارتی رہتی ہے! میرے جسم کو انھوں نے نکال کر عجائب خانہ میں رکھا ہے، حالانکہ وہ خود

ایک خاموش وعظ کہہ رہا ہے بادشاہوں کا انجام یہ ہونا ہے! عبرت کی آنکھ رکھنے والو میرے انجام سے عبرت و نصیحت حاصل کرو!

سارا تمرد ساری شیخی، ساری گردن کشی، بس زندگی بھر تھی اپنا آرزو اور انجام ہے تو یہ ہے ؎

باز اگر بینم کلیم اللہ را   خواہم از وے یک دلِ آگاہ را

کاش اب کلیم اللہ کی زیارت نصیب ہوتی۔ اب جو وہ ملتے تو اب ان سے نور ایمان ہی کو طلب کرتا!

بیسویں صدی کے فرعون کو آپ نے پہچانا؟ یہ وہ "ذوالخرطوم" ہے جسے دورِ جدید کے فرعونیوں نے لارڈ کچنر آف خرطوم کہہ کر پکارا، مہدی سوڈانی کی قبر کو کھود ڈالنے والا اور خود اپنے انتہائی عروج کے وقت سمندر میں اس طرح غرق ہو کر رہنے والا کہ لاش کا بھی آج تک پتہ نہ چلا۔ اس بڑے فرعون سے، وہ مصر کا چھوٹا فرعون پوچھتا ہے اور اس انداز سے پوچھتا ہے کہ آس پاس کے سننے والوں کے دل بھی عبرت سے ہل جاتے ہیں ؎

قبر ما را علم و حکمت بر کشود   لیک اندر تربتِ مہدی چہ بود

میرے مقبرہ کو تو تم لوگوں نے علمی تحقیقات کا نام لے لے کر کھودا، لیکن ظالم یہ تو بتا کہ غریب مہدی سوڈانی کی قبر کھود ڈالنے سے تجھے کون سی اثری تفتیش اور علمی تحقیق مقصود تھی؟

معا جنت کی خوشبوؤں کی لپٹیں آنے لگتی ہیں اور ان میں بسی ہوئی سوڈان کے مظلوم درویش کی روح برق کی طرح چمکتی اور جگمگاتی متمثل ہو جاتی ہے اور ظالم کو سن کر کہتی ہے ؎

گفت اُو اے کشنر اگر داری نظر   انتقامِ خاکِ درویشے نگر!

آسمان خاک ترا گورے نداد   مرقدے جز در یم شورے نداد"

اے بصارت سے محروم کچنر اب تو تو نے اپنا بھی انجام دیکھ لیا، ایک بے بس درویش کا انتقام، تجھ قدرت والے اور حکومت والے سے کیسا لیا جا کر رہا! تو نے قبر سے نکال کر

کسی جسم کو بے حرمت کیا تھا! نتیجہ دیکھا کہ تیرے لاشہ کے قبول کرنے سے سطح زمین کے چپہ چپہ نے انکار کر دیا اور آخر تجھے جگہ ملی تو شور سمندر کی تہ میں! اس کے بعد اس مجاہد کی روح قلب کے سوز اور سینہ کے گداز کے ساتھ یوں مناجات میں لگ جاتی ہے۔

گفت "اے روحِ عرب بیدار شو	چوں نیاگاں خالقِ اعصار شو!
اے فواد اے فیصل اے ابنِ سعود	تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود!
زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت	در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت!
خاکِ بطحا خالدے دیگر بزائے	نغمۂ توحید را دیگر سرائے
اے نخیلِ دشتِ تو بالندہ تر	بر نخیزد از تو فاروقے دگر!
اے جہانِ مومنانِ مشک فام	از تو می آید مرا بوئے دوام!
زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر	تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر!
بر مقامِ خود نیائی تا بہ کے	استخوانم در تنِ نالد چو نے!"

اے عرب کی روح! تو کیوں بیدار نہیں ہوتی اور کیوں نہیں اپنے وہ کارنامے دکھا دیتی، جو تیرے اسلاف چھوڑ گئے ہیں۔ اے مصر کے، عراق کے حجاز کے بادشاہو! کب تک بس اپنی نفسی نفسی میں پڑے رہو گے! اٹھو اور اپنے دلوں میں وہ سوز پیدا کرو جو آخر کبھی تو رہ چکا ہے! اٹھو اور ہمت کرو کہ عظمت کے گذرے ہوئے دن پھر واپس آجائیں! اے خاکِ مکہ، کاش تو ہی کسی دوسرے خالد جانباز کو از سرِ نو پیدا کر اور دنیا کو ایک بار پھر توحید کا ترانہ سنا دے! اے سرزمینِ پاک (اللہ تیرے ریگستان کے کھجوروں میں برکت دے) کیا اب تجھ میں کوئی دوسرا فاروق اعظم نہ پیدا ہو گا؟ اے حبشہ کے پیارے باشندو، مشک کی سی صورت اور رنگ رکھنے والو، تم مجھے کس قدر محبوب ہو لیکن ہمت اور عزم اور ولولہ کے بغیر زندگی کا لطف کیا؟ وہ زندگی ہی کیا جو غیر کی محکومی میں ہو! اللہ وہ دن کب لائے گا جب تمہیں تمہارے اصلی مقام پر فائز دیکھوں میری ہڈی ہڈی سے دعا نکل رہی ہے تو یہی!

سیاسی مخالفوں نے اقبال کو طرح طرح بدنام کیا ہے اور "ٹوڈی" اور سرکار پرست اور غدارِ ملت اور خدا معلوم اور کیا کیا خطابات عطا کر رکھے ہیں لیکن اقبال کے جو اصلی خیالات ہیں وہ خود انھیں کی زبان سے ملاحظہ ہوں۔

مرشد آباد (بنگال) کے میر جعفر اور میسور دکن کے مشہور شیر دل فرمانروا ٹیپو سلطان کے زمانے کے میر صادق سے تاریخ کا کون طالب علم ناواقف ہے؟ ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمانے کے خاص اسباب، انھیں دونوں بزرگواروں کی کارگذاریاں ہوئی ہیں۔ کم از کم اقبال کا تاریخی مطالعہ انھیں اسی نتیجہ تک پہنچاتا ہے۔ اقبال ان دونوں کو اپنی سیر سماوی میں دیکھتے ہیں

جعفر از بنگال وصادق از دکن ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

مگر کہاں؟ کیا جنت میں؟ جنت میں نہ سہی اعراف میں؟ نہیں، دوزخ میں بھی نہیں اور دوزخ بھی ایسے ارواحِ رذیلہ سے پناہ مانگتا اور انہیں اپنے اندر لینے سے انکار کر رہا ہے! ایک عالم انتہا درجہ کا مہیب وزہرہ شکن روبرو ہے۔ مردودیت ومنحوسیت سے لبریز۔ تیرہ وتار، انوار سے دور، ظلمتیں اس پر محیط!

عالمے مطرود و مردودِ سپہر صبحِ او مانند شام از بخلِ مہر!

منزلِ ارواحِ بے یوم النشور دوزخ از احراقِ شاں آمد نفور

اس جہان میں ایک قلزم خونیں رواں ہے اس کی ہولناکیوں کا کیا بیان ہو۔ ہوش و حواس فرطِ ہیبت سے غائب، معانی الفاظ کے سایہ سے گریزاں! اف ری دہشت،

تن ز سہمش بے خبر گردد زجاں!

موج ہا درندہ مانندِ پلنگ از نہیبش مردہ بر ساحل نہنگ

اس بحرِ خونیں میں وہی دو غدارانِ وطن ایک کشتی پر بیٹھے اپنی قسمت کو روتے اور شیر سے بڑھ کر مہیب موجوں کے تھپیڑے کھاتے آپ ڈوبتے اور جب ڈوبتے ہوئے ۔

اندراں زورق دو مردِ زرد روئے زرد رُو، عریاں بدن، آشفتہ موئے!

اتنے میں خود ارضِ ہند ــــ "آں عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں"۔

کی روح نمودار ہوتی ہے، حسین و جمیل، جبین پر نور، اور آنکھیں پر سرور، لیکن قید و بند میں جکڑی ہوئی اور زبان پر آہِ سوزاں اور نالہائے پُر درد، عارف رومی کی روحانیت بتاتی ہے کہ یہی ہندستان مظلوم ہے ؎

گفت رومی "روح ہندست این نگر　　　از فغانش سوزہا اندر جگر"!

روح ہندوستان عالم بالا میں فریاد کر رہی ہے اور رو رو کر دوسروں کو رلا رہی ہے۔

مُرد جعفر زندہ روح او ہنوز!

جعفر تو گیا لیکن جو بیج بو گیا وہ بہرحال ایک تناور درخت ہو چکا ہے۔

ملتے را ہر کجا غارت گرے است　　　اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں　　　الاماں از جعفرانِ این زماں

آج بھی جتنے قوم فروش اور غدار ملت موجود ہیں ان سب کی اصل کسی صادق کسی جعفر غرض کسی غدار اعظم ہی تک پہنچتی ہے، اللہ ان غداروں سے بچائے، اللہ اس جعفر کا تخم ریزی کے ثمرات سے اپنی حفظ و امان میں رکھے ان بدبختوں کا ٹھکانہ دوزخ میں بھی نہیں اپنے سروں کو پیٹ پیٹ کر فریاد کر رہے ہیں۔

نے عدم ما را پذیرد نے وجود　　　وائے از بے مہریٔ بود و نبود!

تا گریختیم از جہانِ شرق و غرب　　　بر در دوزخ شدیم اندر دو کرب!

ق

یک شرر بر صادق و جعفر نزد　　　بر سرِ ما مشتِ خاکستر نزد

گفت دوزخ را خس و خاشاک بہ　　　شعلۂ من زیں دو کافر پاک بہ

ہائے ہماری کم بختی، کہ زندگی ہم کو پوچھتی ہے نہ موت! ہائے ہماری شامت اعمال کہ موت و حیات دونوں ہم سے روٹھ گئے! ہائے ہماری بدنصیبی کہ دنیا سے گذر کر ہم عالم آخرت میں پہنچے تو دوزخ کے دروازے پر گئے کہ کاش وہی ہمیں قبول کر لے جس عذاب ناقابلِ بیان میں ہم گرفتار ہیں اس سے تو شاید جہنم ہی کی آگ غنیمت ہوتی، لیکن ہم کمبختوں کو تو دوزخ تک نے

قبول نہ کیا۔ بلکہ واپس کر دیا، اور خود پناہ مانگنا شروع کر دیا کہ الٰہی' ایسوں کے سایہ سے محفوظ رکھ!
کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنی مدد کیلئے پکار رہے ہیں، کوئی بھی ان پر نگاہ رحم نہیں ڈالتا کوئی بھی
ان کی فریاد کو نہیں پہنچتا ؎

اے ہوائے تند! اے دریائے خون! اے زمین! اے آسمانِ نیلگوں!
اے نجوم! اے ماہتاب! اے آفتاب! اے قلم! اے لوحِ محفوظ! اے کتاب

اور شعر تو یہ کہا کہ' اس ایک شعر پر دوسروں کے دیوان قربان

اے تبانِ ابیض! اے لردانِ عرب! اے جہاں در بغل بے حرب وضرب!

اے گورے رنگ کے خداوند! اے فرنگستان کے امیر اور امیر زادو' اے سارے جہاں کو بے لڑے
بھڑے اپنے قبضہ میں لے لینے والو!

کیا سارے "کانگریسی" لٹریچر میں اس سے زیادہ کچھ مل سکتا ہے کیا بڑے بڑے احرار" نے
اس سے زیادہ کچھ کہا ہے؟

ایں جہاں بے ابتدا بے انتہا ست! بندۂ غدار را مولا کجا ست!

یہ وہی بدنام اقبال ہے جو (بعض مہربانوں کا خدا بھلا کرے) بیچارہ خود ہی اپنی قوم میں غدار
قوم فروش اور خدا جانے کن کن خطابات سے سرفراز ہو چکا ہے! ہا! دنیا بھی کیسی اندھی ہے
اور اس کے فیصلے کس قدر نا منصفانہ ہوتے ہیں!

ہاں اقبال کا جرم یہ ضرور ہے کہ اتنی وطن دوستی کے باوجود وہ وطن پرستی کا روادار نہیں
اس کا مذہب وہی ہے جو شیخ الہند محمود حسن رح کا تھا۔ احرار کے رہبر و سردار محمد علی رح کا تھا۔ اسے
مقصود وطن کی خدمت ہے' وطن کی پرستش نہیں' وطنیت کا جو بت فرنگیوں کا گڑھا اور کھڑا کیا
ہوا ہے اس نے اس کا نازک تار الگ کر کے رکھ دیا ہے ظاہر بین خوش ہو رہے ہیں کہ ایران رضا شاہ پہلوی
کے عہد میں کیسی کیسی ترقیاں کر رہا ہے شاعر کی نگاہِ حقیقت شناس دیکھ رہی ہے کہ "یہ ترقی" عین
ترقیٔ معکوس ہے ؎

کشتۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ — خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ!

کارِ آں وارفتۂ ملک و نسب — ذکرِ شاپور است و تحقیرِ عرب!

روزگارِ او تہی از واردات — از قبورِ کہنہ می جوید حیات!

باوطن پیوست و از خود در گذشت — دل بہ رستم داد و از حیدر گذشت!

نقشِ باطل می پذیرد از فرنگ — سرگذشتِ خود بگیرد از فرنگ

یہ ناداں اتنا نہیں سمجھتے کہ شاپور اور یزد جرد کی عظمتیں تو از خود بجھ چکی تھیں ایران کے تنِ مردہ
میں اگر جان دوبارہ پڑی تو اسلام ہی کے طفیل میں، بادیہ نشینانِ عرب ہی کی مسیحائی سے۔
ایران اور روما اپنے زمانہ کی دو برابر کی طاقتیں تھیں ایران نے اسلام قبول کر لیا۔ آج تک
زندہ ہے روما نے دینِ الٰہی سے اعراض کیا مدت ہوئی نام ونشان بھی نہ باقی رہا۔

موجِ مے در شیشۂ تاکش نبود — یک شرر در تودۂ خاکش نبود!

تا ز صحرائے رسید آں محشرے — آنکہ داد او را حیاتِ دیگرے!

ایں چنیں حشر از عنایاتِ خدا است — پارس باقی رومتہ الکبری کجاست؟

مردِ صحرائی بہ ایراں جاں دمید — باز سوئے ریگ زارِ خود رمید!

آہ احسانِ عرب نشناختند — ز آتشِ افرنگیاں بگداختند

وطنیت کا افسوں بھی عجب افسوں ہے ترک ترکیت میں، ایرانی ایرانیت میں، مصری مصریت
میں، عرب عربیت میں غرق ہوتے جا رہے ہیں اور اسلامیت کی طرف سے غافل و بے پروا
حالانکہ نظم و مرکزیت اگر پیدا ہو سکتی تھی تو صرف اسلامیت ہی کے رشتہ سے، جھاڑو کا بند کھل
گیا! اور ایک ایک سینک مسرور و نازاں ہے کہ آزادی مل گئی! یہ وطنیت نہیں ہے محمد علیؒ کے
الفاظ میں "وثنیت" ہے توحید الٰہی کے مقابلہ میں ایک دوسرا بت!

لردِ مغرب آں سراپا مکر و فن — اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن

او بفکرِ مرکز و تو در نفاق — بگذر از شام و فلسطین و عراق

تو اگر داری تمیزِ خوب و زشت — دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت

آہ کیسی نادانی اور کور نہی ہے کہ جو جنت کا طالب تھا وہ محض مٹی کے ڈھیلوں پر قانع ہو کر رہ گیا ہے اور اس پر فخر کر رہا ہے!

چیست دیں؟ برخاستن، از روئے خاک	تا ز خود آگاہ گردد جانِ پاک!
می نہ گنجد آنکہ گفت اللہ ہو	در حدودِ ایں نظامِ چار سو

آفتاب نکلتا بیشک مشرق سے ہے لیکن نکل کر پھر مشرقی نہیں رہ جاتا، شرق و غرب، شمال و جنوب سب ہی اس کے احاطۂ تسلط میں آجاتے ہیں بات بالکل موٹی ہے مگر جو سمجھنا نہ چاہیں ان کے دل میں کیسے اتار دی جائے شاعر غریب اپنی والی سمجھانے میں کچھ اٹھا رکھتا نہیں ؎

آں کفِ خاکے کہ نامیدی وطن	ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہلِ وطن را نسبتے است	زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر	نکتۂ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق بر آید آفتاب	با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوزِ درون	تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں
فطرتش از مشرق و مغرب بری است	گرچہ او از روئے نسبت خاوری است!

وطن کی نسبت تو جانور بھی رکھتے ہیں، وطن کیلئے تو کتے اور بلی بھی جان دے سکتے ہیں۔ انسان کیلئے یہ کون سی فخر کی بات ہے کہ مٹی کے گھروندوں کے پیچھے جان دے رہا ہے، اُسے مرنا چاہیئے تو کسی مقصد IDEAL کے خاطر اور مرضی حق کی طلب سے بڑھ کر بلند تر کوئی مقصد اب تک دنیا کے سامنے پیش ہو سکا ہے؟ دوسری قوموں کی اگر نظر بھی ان بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتی تو وہ بے چاری معذور رہیں غصہ اپنوں پر آتا ہے ان پر کیا شامت سوار ہے کہ آسمانوں کے ہوتے ہوئے زمین کی طرف جھکتے اور گرتے ہیں؟

سیاسیات کی بحث تو بہت بعد کو آتی ہے فرنگیوں کے ہاتھ میں اصل جادو تو انکی جگمگاتی ہوئی تہذیب کا ہے جس کیلئے اقبال نے بھی کہیں اور (شاید اسرارِ خودی میں) کہا ہے ؎

گلستانے لالہ زارے عبرتے | چوں گل کاغذ سراب نکہتے

ان کے جگمگاتے ہوٹل اور ناچ گھر ان کے کلب اور شراب خانے، ان کے چڑیا گھر اور عجائب خانے ان کے بنک اور کوٹھیاں، ان کے سنیما اور تھیٹر، شاعر اس نگار خانے میں قدم رکھتا اور رنگ رنگ کے سوانگ کو دیکھتا ہے اور زیرِ لب مسکراتا جاتا ہے ؎

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب | نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب!
نے ز سحرِ ساحران لالہ روست | نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست!
محکمی او را نہ از لادینی است | نے فروغش از خطِ لاطینی است!

"محکمی" اور "قوت" "و فروغ" کا اعتراف بہتان اب بھی موجود ہے۔ ایک قدم آگے بڑھ کر "وضوحِ کامل ہو جاتا ہے اور حقائق سے پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے ؎

می شناسی چیست تہذیبِ فرنگ | در جہانِ او دو صد فردوس رنگ!
جلوہ ہایش خانمانہا سوختہ | شاخ و برگ و آشیانہا سوختہ!
ظاہرش تابندہ و گیرندہ ایست | دل ضعیف است و نگہ را بندہ است!
چشم بیند دل بلغزد اندروں | پیشِ ایں بتخانہ افتد سرنگوں!

ایک جگہ اور ان کی منع تولید (اولاد کشی) وغیرہ کی کوششوں کا ذکر کر کے کیا خوب کہا ہے کہ ان سے لینے کے قابل کوئی چیز بجز عبرت کے ہے کیا؟

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ | مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ
حقہ بازاں چوں سپہرِ گرد گرد | از امم بر تختۂ خود چیدہ نرد!
شاطراں، این گنج ور آن رنج بر | ہر زماں اندر کمینِ یک دگر
فاش باید گفت سرِ دلبراں | ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں!
دیدہ ہا بے نم ز حبِ سیم و زر | مادراں را بار دوش آمد پسر
وائے بر قومے کہ از بیمِ ثمر | می برد نم را ز اندامِ شجر!
تا نیارد زخمہ از نازش سرود | می کشد نا زادہ را اندر وجود!

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ　　　من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

اس با جمعیت کے عروج کو دیکھ کر مسرت اگر کسی کو ہے تو معبود قدیم ،ہبل کو کیسا اچھل اچھل کر گا رہا ہے کہ (خاکم بدہن) اب فتح میں کیا دیر ہے محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کو اب مار ہی گرایا ہے ؎

زندہ باد افرنگئ مشرق شناس　　　آنکہ مارا از لحد بیرون کشید

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

در نگر آں حلقۂ وحدت شکست　　　آل ابراہیم بے ذوق الست!

مرد حُر افتاد در بند جہات　　　با وطن پیوست و از یزداں گست!

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

شاعر گھومتا گھامتا کرہ مریخ میں پہنچتا ہے اور یہاں ایک لیڈی صاحبہ سے دوچار ہوتا ہے پہلے ان کا سراپا ملاحظہ ہو:

چہرہ اش روشن ولے بے نور جاں　　　معنیٔ او بر بیانِ او گراں!

حرف او بے سوز و چشمش بے نمے　　　از سرور آرزو نامحرمے!

فارغ از جوش جوانی سینہ اش　　　کور و صورت ناپذیر آئینہ اش!

چہرہ کا رنگ گورا، لیکن باطن سیاہ اور قلب بے نور زبان رواں، لیکن معنی الفاظ کا ساتھ چھوڑے ہوئے نہ الفاظ میں سوز وگداز کا پتہ، نہ آنکھوں میں کسی تری کا نشان۔ قلب، مقصد اعلیٰ (ایمان) سے ناآشنائے محض! دیکھنے میں جوان، لیکن جوانی میں جو ولولے فطرۃً ہوتے ہیں وہ سب غائب، گویا ایک آئینہ جس کی جلد اڑی ہوئی اور ان صاحبہ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ ؎

از مقام مرد و زن دارد سخن　　　فاش تر می گوید اسرار بدن!

مرد و عورت کے تعلقات پر خوب خوب نکتہ بیان کرتی ہیں اور اعضائے جسم کی تشریح تو اس قدر بے جھجک ہو کر بیان فرماتی ہیں کہ شرم وحیا کہیں آس پاس بھی نہیں ہوتی ایسی

درلغمت بھلامریخ کی پیداوار کہاں ہوسکتی تھی بتایا یہ گیا کہ

فرزمرزا ورا بدزدید از فرنگ

ترہ مریخ کا ابلیس انھیں ارض فرنگستان سے اٹھا لایا ہے۔ یہ خاتون دعوت نبوت کرتی ہیں
رن پرستوں کے ملک میں نبوت عورت کو نہ ملتی تو اور کیسے ملتی ؟ یہ "روشن خیال" "روشن
میر" "حریت پرور" "برق زبان" "نبیہ" تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں تو بس بعینہٖ یہ معلوم
وتا ہے کہ لیڈیز کانفرنس کے پنڈال میں کسی رزولیوشن پر دادِ خطابت دی جارہی ہے وہی
ردوں کے مظالم کی داستاں . . . . وہی نسوانیت سے انکار، وہی آزادی
ارٹ، وہی فطرت سے جنگ پہ دلیری اور آخر میں وہی برتھ کنٹرول کی سائنٹیفک
عوت!

اے زنان! اے مادراں! اے خواہراں!	زیستن تا کے مثالِ دلبراں!
دلبری اندر جہاں مظلومی است	دلبری محکومی و محرومی است!
در دو گیسو شانہ گردانیم ما	مرد را نخچیرِ خود دانیم ما
خود گدازیہائے او مکر و فریب	درد و داغ و آرزو مکر و فریب
گرچہ آں کافر حرم ساز د ترا	مبتلائے درد و غم ساز د ترا
ماربیچاں! از خم و پیچش گریز	زہرہایش را بخون خود مریز!
از امومت زرد روئے مادراں!	اے خنک آزادیٔ بے شوہراں!
آمد آں وقتے کہ از اعجازِ فن	می تواں دیدن جنین اندر بدن!
گر نباشد بر مرادِ ما جنین	بے محابا کشتنِ او عینِ دیں!
در پس ایں عصر اعصارِ دگر	آشکارا گردد اسرارِ دگر
پرورش گیرد جنیں نوعِ دگر	بے شبِ ارحام دریابد سحر!
تا بمیرد آں سراپا اہرمن	ہمچو حیوانات ایامِ کہن!
خیز و با فطرت بیا اندر ستیز	تا ز پیکارِ تو حُر گردد کنیز!

اے معزز خاتونو! اے ماؤ! اے بہنو! یہ گڑیوں کی سی پردہ کی زندگی کب تک؟
یہ خانگی زندگی، تم اسے محبوبی کہتی ہو، حالانکہ یہ عین غلامی ہے محکومی ہے محرومی ہے، مظلومی ہے! تمہاری آزادیاں سلب کر لی گئیں، تمہارے حقوق پامال کر دیئے گئے، تمہیں لونڈی بنا دیا گیا اور تم اپنی سادہ دلی سے خوش ہو رہی ہو کہ گھر کے اندر شوہر تمہاری خاطرداریاں کرتے رہتے ہیں، خود تمہارے اشاروں پر چلتے رہتے ہیں! یہ محض دھوکا اور فریب ہے مرد کی یہ محض چالیں ہیں! خبردار آج سے اس فریب میں نہ آنا وہ لاکھ تمہاری دلدہی کریں تمہیں چہیتی بیوی بنا کر رکھیں اپنی معشوقہ بنائیں تم سے لاکھ مہر و الفت کے پیماں کریں ہرگز اس کی باتوں میں نہ آنا، اس کے جال میں نہ پھنسنا، سب مکر ہے مکر، اس کا مقصد محض تمہیں اپنی کنیزی میں لینا ہے۔ اُف، ظلم ہے ظلم، کہ تمہیں بچہ جننے کی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے! آہا کیا پیارا اور خوش آئند ہوگا وہ دن جب ہم شوہروں کی قید سے آزاد بچہ جننے کی کلفتوں سے آزاد، بے شوہر بلا روک ٹوک آزادی کامل کے ساتھ گھومتی پھیریں گی، اور میں آپ کو بتاؤں، ہماری سائنٹفک ترقیاں اب اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ ہم رحم کے اندر کا حال اپنے آلات سے مشاہدہ کر لیتے ہیں اور اب ہمارے بالکل اختیار میں ہے کہ چاہیں تو رحم میں بچے کو بڑھنے اور پلنے دیں اور چاہیں تو اسی وقت اس کا خاتمہ کر دیں۔ اور ابھی کیا ہے ایک دن اور آتا ہے۔ کیا مبارک دن وہ آنے والا ہے جب مرد کی وساطت کے بغیر، اگر جی چاہے گا تو ہم خود ہی بچہ پیدا کر لیا کریں گے اور رفتہ رفتہ ہم اس کرخت مخلوق کو جس کا نام مرد ہے میدان کائنات سے فنا کر کے رہیں گے، جیسے اس سے پیشتر بھی رفتار ارتقاء میں بے شمار قسم کے حیوانات فنا ہو چکے ہیں! اٹھو میری بہادر خاتونو! ہمت کر کے اٹھو! لڑو اپنی آزادی کی خاطر، حریت کاملہ کی خاطر، فطرت سے لڑو اور فطرت کے جن قاعدوں اور قانونوں نے تمہیں اب تک زیر کر رکھا تھا۔ انہیں توڑ، پھوڑ کر رکھ دیا۔

عارف رومی کی روح ابنیت حیرت و عبرت کیساتھ اس خطبہ حریت کو سنتی رہتی ہے اور پھر شاید عبرت و حسرت کے لہجے میں یوں زمزمہ سنج ہوتی ہے ؎ مذہب عصر نو آئینے نگر ÷ حاصل تہذیب الاد ینے نگر!
تہذیب جدید کا مسلک دیکھ لیا! بے دینوں کے تعلیم و تمدن کے اثرات چکھ لئے۔ اور اس سے زیادہ یا اس کے علاوہ ہم اور آپ اور کوئی کچھ بھی کیا سکتا ہے۔

^ ^ ^

ارمغانِ حجاز

اقبال کی موت، ایک شخصی و انفرادی حادثہ نہیں، امت اسلامیہ کے حق میں ایک صدمہ
تھی۔ حکمت کاملہ نے عین اس وقت انہیں اٹھالیا، جب ہم بظاہر بینوں کی محدود نگاہیں ان کی
ورت سب سے زیادہ محسوس کر رہی تھیں اور اب دل کی کلیاں مرجھا چلی تھیں کہ قافلۂ امت کا بانگ
ا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا لیکن غنیمت ہے کہ زبان آہنگ بند ہوتے ہوتے کچھ نئے نغمے سنا
ئے۔ اور یہ انہیں آخری نغموں کا مجموعہ ہے جو ارمغانِ حجاز کے نام سے خوشنما کاغذ اور طبع و
بت اور دیدہ زیب جلد کے ساتھ ظاہری دلکشی سے پوری طرح آراستہ ابھی نکلا ہے اور شیخ
ا اشرف صاحب تاجر کتب کشمیری بازار لاہور سے مل سکتا ہے۔

ضخامت ۲۸۰ صفحات کی ہے اس میں سے ۲۱۰ صفحے فارسی کی نذر ہیں باقی ۷۰ صفحوں میں منظومات
د ہیں۔ کلام کا اصلی لطف تو پوری کتاب پڑھنے سے آئے گا باقی جستہ جستہ مقامات کی سیر
ں سرسری تبصرہ کے ذریعہ بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اقبال نے شکوہ جوانی کے زمانے میں لکھا تھا
وہ کس کا کس سے تھا؟ بندہ کا مالک سے، عبد کا معبود سے، غلام کا آقا سے تھا۔ بندہ کو اپنی
گی کا احساس پورا پورا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے مولیٰ و آقا کی شفقت پر اعتماد بھی ہے وہ
لک سے جتنا ڈرتا ہے اس سے زیادہ اس سے ناز بھی کرتا رہتا ہے اور مقام ناز پر آکر معلوم ہے
بندہ کتنا شوخ گفتار ہو جاتا ہے" ارمغانِ حجاز" جوانی کے بعد کا کلام ہے لیکن اسی "شکوہ" والی

شوخ گفتاری کا انداز جابجا اس میں موجود ہے اور چونکہ پختہ کاری کے ساتھ ساتھ سوزِ دل بھی اب بہت بڑھ گیا ہے اس لئے قدرۃً طنز میں شدت اور تعریض میں حدت بھی اب ترقی پر ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ رُوئے زمین کے چپہ چپہ پر اغیار چھائے جا رہے ہیں اور مسلمان ہیں کہ وسعتِ ارض ان پر روز بروز سکڑتی اور تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک صاف اور سادہ حقیقت ہوئی، شوخ گفتار شاعر اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر اپنے ترکش طنز سے تیر چلاتا ہے اور کہتا ہے کہ "کیوں نہ ہو" زمین کی یہ بخشش سوداگروں اور دوکاندار قوموں پر کیوں نہ ہو اور اپنے پیدا کئے ہوئے جہاں سے اپنے ہی کیوں نہ محروم رکھے جائیں، لامکاں والے کو دنیا زادوں کے مکان کی قدر ہی کیا ہو سکتی ہے!

چہ حاجت طول دادن داستاں را | بحرفے گویم اسرارِ نہاں را
جہانِ خویش با سوداگراں داد | چہ داند لامکاں قدر مکاں را!

شوخی کا ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور بندہ جلے ہوئے دل سے یوں گویا ہوتا ہے۔ کہ فرنگی کو دیکھو، کس طرح دورِ حاضر کا رزاق بن گیا ہے، شیطان کی کس کس طرح رزاقی کرتا ہے (نعوذ باللہ) خود رزاقِ حقیقی کو حیرت ہو کر رہ جاتی ہے۔!

فرنگ آئینِ رزاقی بداند | بدیں بخشد از وا می ستاند
بہ شیطاں آنچناں روزی رساند | کہ یزداں اندراں حیراں بماند

اہلِ سکر و جذب کو عالمِ بیخودی میں ایسی گستاخی گوئی ہمیشہ سے معاف رہی ہے عارف روم کی زبانی

ہیچ آدابے و ترتیبے مجو | ہر چہ میخواہد دلِ تنگت بگو
کفرِ تو دیں ست و دینت نورِ جاں | ایمنی وز تو جہانے در اماں
اے معاف یفعل اللہ ما یشا | بے محابا او زباں را بر کشا

لیکن یہ رنگ کہیں کہیں ہے ورنہ اصل تعلیم تو یہی ہے کہ ؎

بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

ادب شناسوں کی طرح اپنے مقامِ عبدیت کو پہچان کر ہدایت اس کی کرتے ہیں کہ دل

اللہ سے لگائے قدم راہ مصطفوی پر اٹھاتے رہو۔ بس اس کے سوا نہ کوئی دوسرا نظریہ اور فلسفہ ہے

به منزل کوش مانند مهِ نو | درین نیلی فضا هر دم فزون شو
مقام خویش اگر خواهی درین دیر | بحق دل بند و راهِ مصطفیٰ رَو

خودداری اور خود اعتمادی کا جو سبق بندۂ مومن کو اسرار خودی و رموز بیخودی کے وقت سے دیتے چلے آرہے ہیں اس کی تکرار ارمغان حجاز میں بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ترقی بلکہ زندگی اور بقا بھی اگر مدنظر ہے تو غیروں کی تقلید حرام سمجھو۔ دوسروں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو، اپنی جگہ پہ قائم رہو اور یہ نہیں تو موت وفنا رکھی ہوئی ہے۔

مسلماں از خودی مردِ تمام است | بخاکش تا خودی میرد غلام است
اگر خود را متاعِ خویش دانی | نگہ را جز بخود بستن حرام است

مسلماناں کہ خود را فاش دیدند | بہر دریا چو گوہر آرمیدند
اگر از خود رمیدند اندریں دیر | بجانِ تو کہ مرگِ خود خریدند

مسلماں رہ کر جینا چاہتے ہو تو وہی راہِ مصطفوی کھلی ہوئی ہے کافر ہو کر مرنا منظور ہے تو اس کی راہ دین سے علیحدگی ہے۔

کشودم پردہ را از روئے تقدیر | مشو نومید و راہ مصطفیٰ گیر
اگر باور نداری آنچہ گفتم | ز دیں بگریز و مرگِ کافرے میر!

خلافت کی یہ حقیقت اگر ترکوں کی سمجھ میں آگئی ہوتی تو آج ان کی تاریخ کا دامن الغاشے خلافت کے داغ سے سیاہ نہ ہوتا۔

خلافت بر مقامِ ما گواہی است | حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ | خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است!

"دختران ملت" کے نام پیام ہے کئی صفحوں میں مفصل۔ کہیں کہتے ہیں کہ اے بیٹی اسلام ہو کر کافر عورتوں کی طرح غازہ اور پوڈر کی زندگی تیری شایان شان نہیں تیرے پاس تو

شمشیر نگاہ ہونی چاہیئے وہ شمشیر جو حیا و عفت کے پانی میں بجھی ہوئی ہو اور کہیں اس نکتہ کو کھو لیتے ہیں کہ قوم و ملت کی زندگی کا راز اچھی ماؤں کے وجود سے وابستہ ہے اور بہترین مکتب و مدرسہ نگاہِ مادری ہے۔ اسی سلسلہ میں آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ اے بیٹی عہد حاضر کی بے حجابی سے بچ کر سیدہ فاطمہ رضؓ کا طریقہ اختیار کر، اور کسی حسینؓ کی پرورش کر!

اگر پندے ز درویشے پذیری	ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر	کہ در آغوش شبیرؓ بگیری

عمر فاروق کے ایمان لانے کا واقعہ تاریخ میں ہم سب بڑھ چکے ہیں۔ اقبال کی نکتہ رس نگاہ اس، اُس واقعہ کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ ابن خطاب کا دل جو اُس وقت تک عداوتِ اسلام میں پتھر تھا اگر پسیجا، تو ایک عورت (اپنی بہن) ہی کی قراءتِ قرآن سے! اس لئے اے بیٹی! تو پھر آج قراءتِ قرآن میں مشغول ہو۔ اور دنیا کو قرآن کی طرف بُلا!

زشامِ ما برون آور سحر را	بہ قرآن باز خواں اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قراءتِ تو	دگر گوں کرد تقدیرِ عمر را

اقبال کی فارسی اور اردو میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ اصل شئے کلام اقبال سے مانوس ہونا اور پیام اقبال کو سمجھ لینا ہے، اس میں جتنی دیر بھی لگ جائے لیکن بس اس مرحلہ سے گزر چکنے کے بعد پھر کوئی خاص دشواری ان کے کسی کلام کو سمجھنے میں نہیں رہ جاتی ہے اور بغیر اس کے ان کا ہر کلام دشوار ہے تاہم اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ عالم ناظرین کے لئے اردو فارسی سے زیادہ قریب الفہم ہے اور یہ حصہ اردو، جہاں تک بلندی فکر کا تعلق ہے، حصہ فارسی سے ذرا بھی کم نہیں ہے اس لئے جو لوگ فارسی کے نام سے ڈرے ہوئے ہیں وہ بھی کم از کم اس حصہ سے پورے لطف اندوز اور اس کتاب کے خاصے حصہ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

ایک دوزخی مناجات کر رہا ہے اور اس حال میں یہ کہہ رہا ہے کہ یہاں کا عذاب جو کچھ بھی سہی، لیکن یہ خطہ، کم از کم فرنگی تاجر کی غلامی کے عذاب سے آزاد ہے۔

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت	جو کچھ ہے وہ ہے فکر ملوکانہ کی ایجاد

الحمدللہ! ترا شکر کہ یہ خطۂ پرسوز　　سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

ں انتہائی تعریض پہ ایک شعر اکبرؒ الٰہ آبادی کا بھی یاد پڑ گیا۔ دورِ حاضر کے سامعین کے آگے
درت باری وعظمتِ الٰہی کا بیان کر رہے ہیں اور جب کوئی مؤثر عنوان سمجھ میں نہیں آتا تو
ہتے ہیں۔ "صاحبو! بس یہ سمجھ لو کہ اللہ میاں کو کلکٹر کے اختیارات حاصل ہیں":

اس کی عظمت کا کروں آپ سے کس طرح بیاں　　میں تو اللہ تعالیٰ کو کلکٹر سمجھا!

صہ۲۵۱ پہ ایک رباعی کا پہلا شعر ہے

غریبی میں ہوں محسودِ امیری　　کہ غیرتمند ہے میری فقیری!

۲۷۷ پہ اس متن کی شرح بھی اقبال کی ذاتی زندگی سے موجود ہے۔ وفات سے کچھ ہی روز قبل
ـــ کون جان سکتا تھا کہ وقتِ موعود اتنا قریب آلگا ہے ـــ معتقدوں اور قدردانوں
نے "یومِ اقبال" دھوم دھام سے منایا تھا۔ صدرِ اعظم دکن کے دستخط سے ایک ہزار کا چیک
عوت کے نام سے وصول ہوا۔ شاعر نے جو قطعہ لکھ کر بھیجا اس کے دو شعر آخری ملاحظہ ہوں

ئیں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا ہر دوش　　کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول　　جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

بہترین اور مؤثر نظم اس حصہ میں کیا معنی ساری کتاب میں وہ ہے، جو "ابلیس" کی مجلسِ شوریٰ
کے عنوان سے صہ۲۱۳ سے صہ۲۱۵ تک آئی ہے اور جس کے اندر اقبال کی ساری تعلیم کا مغز یا لبِ
باب آگیا ہے۔ ابلیس اپنی مجلسِ شوریٰ میں کہتا ہے کہ

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب　　میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا　　میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں!

غضب ہے کہ میری اس آباد کی ہوئی دنیا کو ـــ "ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خون
کو" ـــ آج کارسازِ اعظم برباد کرنے پہ تلا ہوا ہے، دیکھوں تو کون ایسا کر سکتا ہے؟ پہلا
مشیر کہتا ہے کہ توبہ کیجیے، بھلا کس کی مجال ہے کہ ہمارے نظام کو درہم برہم کر سکے ـــ ہم
نے ہر طرح کے انتظامات مکمل کر رکھے ہیں ـــ

صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام! | یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام! | ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا

دوسرا مشیر پہلے کو دخل در معقولات دے کر بول اٹھتا ہے کہ تجھے شاید جمہوریت دعمومیت کے جدید ہنگامہ کی خبر نہیں! وہ کڑک کر جواب دیتا ہے کہ خبر کیوں نہ ہو اور خبر کیسی، یہ تو خود ہمارا ہی پھیلا ہوا جال ہے، کچھ نام اور اصطلاحیں نئی کر دی ہیں اور اصل حقیقت پہلے سے بھی زیادہ گہری کر دی ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس ؛ جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام ؛ چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اب تیسرا مشیر گویا ہوتا ہے کہ خیر اور تو سب ٹھیک ہے لیکن مارکس یہودی نے جو سوشلزم اور مساوات کا شرارہ چھوڑ کر رکھا ہے آخر اس کا توڑ ہمارے پاس کیا ہے؟

نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب | وہ کلیمِ بے تجلی وہ مسیحِ بے صلیب

چوتھا بولتا ہے کہ واہ یہ کونسی مشکل بات ہے؟ سوشلزم کے جوڑ پہ ہم نے روما میں فاشزم نہیں کھڑی کر دی ہے؟

پانچواں مشیر لرزتا اور ڈرتا ہوا اپنے سردار کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ آپ ہی جلد خبر لیجئے ورنہ اس کمبخت یہودی نے تو انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے اور قائم کردہ نظام ملوکیت وسرمایہ داری پاش پاش ہو جانے کو ہے۔

اب مجھے ان کی فراست پہ نہیں ہے اعتبار | گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار | وہ یہودی فتنہ گر وہ روحِ مزدک کا بروز
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار | زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیاست پہ مدار | میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے

آخری تقریر خود ابلیس کی ہوتی ہے وہ کہتا ہے تم میرے اثر و اقتدار کو سمجھتے کیا ہو ان بیہودہ اشتراکیوں سے بھلا میں کیا ڈروں گا ان کی مجال جو میرے نظام تہذیب کو ذرا بھی

دھکا پہونچا سکیں ۔

کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے | توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک | مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

ہاں البتہ میری قیادت و سیادت کو اگر ڈر ہے تو ایک دوسری امت سے ہے، جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو خود مٹ جانے پر بھی اگر مجھے مٹا دینے کی قوت کسی قوم میں ہے جس کی مناجاتیں پچھلی رات میں اب تک ناغہ نہیں ہوتیں ! میری اصلی دشمن ہے تو یہی محمدؐ کی امت ہے ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ | کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے | مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

س پناہ مانگتا ہوں تو اسی پیغمبرِ عرب کے تیر سے جس کا ہر نشانہ میرے لئے موت ہے حقیقۃً انقلاب آفرین اسی کا لایا ہوا دین اور اسی کا پھیلایا ہوا آئین ہے ؎

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر | حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف | منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بچنے کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ خود مسلمان کو خوابِ غفلت میں مست رکھو اور بھی رازدانِ دین نہ بننے دو ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے | یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر | جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے | تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں | ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

مبارک ہے وہ قوم جس کو ایسا شاعر نصیب ہو مبارک ہے وہ شاعر جو اپنی یادگار ایسا کلام چھوڑ جائے اور مبارک ہے وہ ناشر جسے ایسے کلام کے نشر و اشاعت کی توفیق ہوئی ۔

▲ ▲ ▲

دو لفظ

"مردِ خدا" کی یاد میں!

(حضرت اقبالؒ کی برسی کے موقع پر مانٹگومری کے بزرگوں کی فرمایش پر لکھ کر بھیجا گیا)

صدیوں پیشتر عربی کے ایک صوفی و صاحب حال شاعر ابن الفارض گزرے ہیں۔ کہتے ہیں، جب وقت آخر قریب آیا، اور برزخ کا انکشاف کچھ ہونے لگا، شاعر نے جنتیوں کے منظر دیکھ، منہ پھیر لیا، اور کہا کہ "میری محبت تو ذات سے تھی، اس کا صلہ کل اتنا ہی!" اس پر سامنے سے وہ منظر ہٹا لیے گئے اور کوئی تجلی خاص کی گئی، جس پر عاشق کی روح بیخود ہو کر خود سے نکل پڑی! لکھنے والے کہتے ہیں کہ علاقہ پنجاب کے رہنے والے ایک صوفی بزرگ اور صاحب دل شاعر نے بھی انھیں واردات کو اپنی زبان میں سنا دیا ہے ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم
گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد
تا نہ بینم رُخِ تو روح رمیدن نہ دہم

یہ بوعلی شاہ قلندر پانی پتی تھے۔ انھیں بھی گزرے ہوئے صدیوں کی مدت ہو چکی اور تاریخ کسی حد تک افسانہ کا رنگ اختیار کر چکی۔ ماضی کو چھوڑ حال میں آئیے اور سند روایت کی لائیے۔

آج سے ٹھیک دس برس پہلے اسی ماہ اپریل میں لاہور کی سرزمین پر ایک نامور شاعر اور بیرسٹر

اور فلسفہ کا ڈاکٹر، بیماریوں سے چور، جسم زار و رنجور، اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گزار رہا ہے
معالجین مایوس ہو چکے ہیں، تیمار دار قدرتی طور پر تشفی و تسلی کی باتیں کرتے ہیں، تو وہ جاں لب
مریض، بجائے کسی قسم کا خوف و ہراس محسوس کرنے کے، اُلٹا ان تیمار داروں کو تسکین دیتا ہے اور
زبان سے یہ غیر فانی الفاظ نکلتا ہے کہ

"میں مسلمان ہوں موت سے نہیں ڈرتا

پھر معاً اپنا شعر بھی سنا دیتا ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم | چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

اللہ اکبر! اتنا اطمینانِ قلب اُس گھڑی بجز مردِ مومن کے نصیب بھی اور کسے ہو سکتا ہے؟

۲۰ اپریل کی شب گزری، ۲۱ اپریل کی صبح طلوع ہونے لگی، پانچ بجکر ۵ منٹ کا وقت
ہے۔ دم توڑتا ہوا شاعر اپنے واحد تیمار دار کو اپنی رباعی سناتا ہے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید | نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے | دگر دانائے راز آید کہ ناید

وعدہ کی گھڑی اپنے وعدے پر آتی ہے، اور عجب نہیں کہ "نسیمِ حجاز" ہی کی شکل میں
آئی ہو اور بولتے ہوئے شاعر کی آواز آخری بار "یا اللہ" کہہ کر اور قبلہ رُو ہو کر اس عالمِ ناسوت
میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی ہے۔ مرنے والا سکون و اطمینان، بے ہراسی و خوش اعتمادی
کی موت کی ایک مثال قائم کر جاتا ہے۔ آیہ کریمہ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ
مرضیۃ کی ایک زندہ اور بولتی ہوئی تفسیر!

لاہور کو خصوصاً اور پنجاب کو عموماً، مبارک ہو کہ فلسفی اور شاعر اور سودردیشیوں
کا ایک درویش، یہیں کی خاک سے اٹھا، اور یہیں کی خاک میں ملا!

اُس کا یہ انجام کیوں نہ ہوتا؟ اس سے بڑھ کر توحید کا پرستار اور شیدائی
دوسرا کون ہے؟

ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ | ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ

لاالہ سرمایۂ اسرارِ ما   پردہ بند از شعلۂ افکارِ ما

اور وہی تو یہ بھی کہہ چکا تھا ؎

دین از و حکمت از و آئیں از و   زور از و قوت از و تمکیں از و

وہی تو اپنی حقیقت یہ بیان کر چکا تھا ؎

نہ با صوفی نہ با مُلا نشینم   تو می دانی کہ من آنم نہ اینم
نویس اللہ بر لوحِ دلِ من   کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم

عشق عشق کی صدا سب لگاتے ہیں اور عاشقی کا دعویٰ سب کر گزرتے ہیں اس نے عاشقی کا لب لباب ان الفاظ میں نکال رکھا تھا ؎

عاشقی توحید را بر دل زدن   وانگہے خود را بہر مشکل زدن

عاشق نے اسی کلمۂ توحید کے سہارے سے اپنے کو ہر مشکل میں ڈالا، اور ہر مشکل اس کے لئے آسان ہو گئی۔ آتشکدہ اُن کے حق میں گلزارِ خلیل بن گیا اور جب زندگی کی سب سے کٹھن گھڑی آئی، جس کے تصور سے اچھے اچھے اتقیا و ابرار بھی لرزتے رہتے ہیں۔ تو اُس کے کان میں فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کی جاں پرور وجاں بخش صدا آئی اور وہ "مردِ خدا" معاً اپنے خدا اور خدا کے آغوشِ شفقت میں جا بیٹھا۔ ▲ ▲

علامہ اقبال کے خطوط

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام

لاہور

۱۶ر جنوری ۱۹۲۲ء

مخدومی، السلام علیکم

نوازش نامے کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کے مختصر الفاظ نے اس موقع پر میرے جذبات کی
نہایت صحیح ترجمانی کی ہے۔ حالات مختلف ہوتے تو میرا طریقِ عمل بھی اس بارے میں مختلف ہوتا۔ لیکن یہ
ات دُنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ اقبال کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں کھُلی کھُلی جنگ اسکی
طرت کے خلاف ہے۔

اسرارِ خودی کا ریویو دیکھنے کا منتظر ہوں۔ سی، آر، داس کا خطبہ صدارت کانگریس آپ نے دیکھا ہوگا۔
س نے اسی روحانی اصُول کو سیاسی رنگ میں پیش کیا ہے۔ اُمید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

لاہور

۱۷۔ اپریل ۱۹۲۲ء

مخدومی، السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ مجھے آپ سے قلبی تعلق ہے اس واسطے ہمیشہ آپ کے
طے مسرت ہوتی ہے۔ "پیام مشرق" اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔ چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں ب
کن افسوس ہے انہیں ختم نہ کر سکا۔ فکرِ روزی قاتلِ روح ہے۔ یکسوئی نصیب نہیں۔ ان سب باتوں کے
لاوہ والد مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے اسے شائع کر دیا جائے۔ آپ کے نوجوان دوست کے تبصرۂ پیام
ں شوق سے پڑھوں گا۔ میرے ایک سکھ دوست اسرارِ خودی کا بھگوت گیتا سے مقابلہ کر رہے ہیں اُنکی

میرے کلام کی مقبولیت محض فضلِ ایزدی ہے۔ ورنہ اپنے آپ میں کوئی ہنر نہیں دیکھتا اور اعمالِ صالحہ کی شرط بھی مفقود ہے۔

مولیٰنا کی کتاب فیہ مافیہ کو آپ خود ایڈٹ کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں وسائل ایڈٹ کرنے کے بہت زیادہ ہیں لیکن آخری ہندی مسلمانوں کو بھی تو یہ کام کچھ نہ کچھ شروع کرنا ہے۔ میری رائے میں آپ یہ ضروری کام خود کریں۔ بعد میں یورپین ایڈیشن بھی نکل آئے گی۔ جوہر کے نعتیہ کلام کو میں نے بھی خاص طور پر نوٹ کیا ہے۔ بلکہ میں تو ان کے روحانی انقلاب کو ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں۔

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص : محمد اقبال

لاہور

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء

مخدومی، السلام علیکم

"پیامِ مشرق" میں چند اشعار "بوئے گل" پر ہیں جو آپ کے ملاحظہ سے گذرے ہونگے۔ آخری شعر ہے۔

زندانی کہ بند نہ پائش کشادہ اند

آہے گذاشت است کہ بُو نام دادہ اند

حال میں جامعہ ملیہ علی گڈھ کے رسالے میں "پیامِ مشرق" پر ریویو کرتے ہوئے مولانا محمد اسلم جیراجپوری "آہے گذاشت است" پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترکیب مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ یہی مطلب کسی اور طرح ادا کرنا چاہیے۔ میں آپ کا خیال معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مولیٰنا سید سلیمان ندوی صاحب سے بھی استصواب کروں گا۔ چونکہ دوسری ایڈیشن جلد نکالنے کا ارادہ ہے۔ اس واسطے اگر آپ کا جواب جلد مل جائے تو بہتر ہو۔ امید کہ مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص : محمد اقبال۔ لاہور

مکرمی۔ پیام امن کے لئے شکر گذار ہوں۔ آپ کا تبصرہ بجائے خود ایک نہایت مفید رسالہ ہے۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص: محمد اقبال

۳۔ نومبر ۱۹۲۳ء

نوٹ: مکتوب الیہ نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ مع اپنے مفصل تبصرہ کے شائع کیا تھا۔

لاہور

۲۶۔ نومبر ۱۹۲۴ء

مخدومی، السلام علیکم

ابھی ایک عریضہ ڈاک میں ڈال چکا ہوں کہ آپ صاحبزادہ صاحب کی خدمت میں فوراً خط لکھیں کہ وہ تجویز معلومہ کورٹ کے سامنے پیش نہ کریں۔ کم از کم مجھ سے ملے بغیر پیش نہ کریں۔ والسلام۔ تاکید مزید عرض کرتا ہوں۔

مخلص: محمد اقبال

لاہور

۲۲ مارچ ۱۹۲۵ء

مخدومی، السلام علیکم

والانامہ مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں مگر آپ کا نوٹ پڑھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے عدیم الفرصتی کی وجہ سے آپ نے وہ مضمون بہت سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ بہر حال میں آپ کا خط زیر نظر رکھوں گا۔ مضمون کا مسودہ ارسال فرمائیے۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص محمد اقبال

نوٹ:۔ اقبال نے اپنے ایک انگریزی مقالہ "اجتہاد" پر رائے طلب کی تھی اور جو رائے دی گئی خاصی مخالفانہ تھی۔

۵؍ جنوری سنہ ۳۰ئہ

مخدومی۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ کل موصول ہوا جس کے لئے شکریہ قبول فرمائیے۔

میں بھی ایک ہفتہ کیلئے علی گڈھ گیا تھا وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ سید راس مسعود بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی مساعی سے یونیورسٹی کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوگی۔ آپ بھی کبھی کبھی وہاں جایا کریں اور مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگو نہیں کیا کریں۔ نتائج بہت اچھے ہوں گے۔ باوجود بہت سی مخالف قوتوں کے جو ہندوستان میں مذہب کے خلاف اور بالخصوص اسلام کے خلاف) اس وقت عمل کر رہی ہیں مسلمان جوانوں کے دل میں اسلام ہی کیلئے تڑپ ہے لیکن افسوس ہے کوئی آدمی ہم میں نہیں جسکی زندگی قلوب پر مؤثر ہو۔

بانگ درا کے تیسری ایڈیشن، جس کی تعداد دس ہزار ہوگی۔ چھپ رہی ہے غالباً دو ماہ تک تیار ہو جائے گی۔

لاہور کانگریس نے آزادیٔ کامل کا اعلان کر دیا ہے۔ جماعتی اختلافات کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا دیکھیں ہندوؤں کا لبرل گروہ ان اختلافات کا کیا فیصلہ کرتا ہے مسلمانوں میں آزادی کیلئے ایک ولولہ موجود ہے، مگر

مشکل ایں نیست کہ بزم از سر ہنگامہ گذشت
مشکل ایں است کہ بے نُقل و ندیم اند ہمہ

مخلص محمدؐ اقبال

لاہور

۲۷؍ جولائی ۱۹۳۴ء

جناب مکرم۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لئے شکریہ قبول فرمائیے۔ میں بڑی خوشی سے ایڈریس

لکھوں گا لیکن اسی دسمبر میں نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو شاید میں ہندوستان میں نہ ہونگا اور اگر ہوا تو ایک اور ایڈریس لکھنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ ہاں آئندہ سال اگر سید راس مسعود چاہیں تو میں حاضر ہوں۔

آپ نے اپنے اخبار میں میرے مضمون کا ذکر کیا ہے جو انگریزی اخباروں میں چھپا ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ اصل میں ایک انٹرویو تھا جو ہنگری کے ایک اخباری نامہ نگار کو دیا گیا تھا۔ اس نے بعض خاص سوالات کئے تھے ان کے جواب دیئے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اس نے اس انٹرویو کو ایک مستقل مضمون کی صورت دے کر انگریزی اخبارات میں بھیج دیا اور بہت سی ضروری باتیں چھوڑ گیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس کے مضمون کا ربط قائم رہے۔ تعجب ہے کہ لکھنؤ کے اخبار ہمدم میں کسی صاحب نے اس پر اعتراضات کئے ہیں جنہوں نے مضمون مذکور کے مقاصد کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھا۔

آپ نے اپنے پہلے خط میں "وطنیت" کے اصول پر اسلام کے اصولِ اجتماعی کو ترجیح دینے میں مجھے امام العصر کہا ہے جس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ ایک نیشنلسٹ اخبار جس کے چار ایڈیٹر ہیں اور چاروں مسلمان ہیں اور جس کا پہلا نمبر لاہور سے آج ہی نکلا ہے۔ لکھتا ہے کہ اقبال نے "وطنیت" کا غدر لگ رکھا ہے۔ ا دیکھا مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان روحانی اعتبار سے کتنے فرومایہ ہیں انکو معلوم نہیں کہ اسلامیت کیا ہے اور "وطنیت" کیا چیز ہے؟ "وطنیت" ان کے نزدیک لفظ وطن کا محض ایک مشتق ہے اور بس۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

محمد اقبال

مخدومی۔ آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے۔ "سچ" کے دو نمبر بھی مل گئے تھے، جن کے لئے شکر گزار ہوں۔ گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے بہت دردمند کر دیا ہے اس لئے جلسوں میں میرے واسطے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ میں کہیں نہیں جا رہا نہ پٹنہ نہ کانپور۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ لاہور

۲۴ ستمبر ۱۹۳۳ء

نوٹ: پٹنہ اور کانپور میں اس سال بہت اہم قومی اجتماعات ہو رہے تھے۔

مکرمی۔ السلام علیکم

جہاں تک مجھے معلوم ہے لفظ برزخ کا کوئی ترجمہ انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ بعض مترجمین قرآن نے لفظ Barrier لکھا ہے مگر یہ بھی درست معلوم نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لفظ برزخ ایرانی لفظ "پروک" کا معرب ہے۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ قدیم ایرانیوں کے نزدیک "پروک" کا کیا مفہوم تھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ موت۔ برزخ۔ حشر و نشر وغیرہ Biological اصطلاحات ہیں اور انکی حقیقت کچھ معلوم نہیں سوائے اس کے جو صوفیائے کرام نے اپنے مکاشفات کی بناء پر لکھی ہے۔ میری رائے میں تو برزخی زندگی کا ترجمہ "Burzukh Life" ہی کریں۔ لیکن حقیقت برزخ پر ایک مفصل نوٹ دینا ضروری ہے۔ اس نوٹ میں موت۔ حشر وغیرہ کی حقیقت بھی اسلامی نقطۂ خیال سے واضح کرنی چاہیئے۔ والسلام

محمد اقبال ۱۹۔ جون ۱۹۳۴ء

نوٹ:۔ مکتوب الیہ نے اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن کے سلسلہ میں دریافت کیا تھا کہ لفظ برزخ کو انگریزی میں کیونکر منتقل کیا جائے۔

مخدومی۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لئے شکریہ قبول فرمائیے۔ میں خدا کے فضل و کرم سے اچھا ہوں۔ صحت عامہ تو قریباً بحال ہو گئی ہے۔ البتہ آواز میں ابھی کسر باقی ہے۔ یہاں کے کالجوں کے مسلمان طلبہ کی ایک جمعیت ہے۔ انہوں نے ایک اپیل شائع کی تھی کہ اقبال کے لئے جمعہ کے روز مسجدوں میں دعا کی جائے۔ اس اپیل سے اخباروں اور ان کے ناظرین کو غلط فہمی ہوئی۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا اور ترجمۃ القرآن کا کام جاری ہو گا۔ والسلام

محمد اقبال

۲۸۔ اپریل ۱۹۳۶ء

نٹشے

رُومی

اور

اقبال

نیٹشے کی ڈالی ہوئی گرہوں کے سلجھانے پر آیئے، تو بات شیطان کی آنت بن کر رہے ۔ جتنی
ـیئے، اُتنی اور الجھتی جائے ۔ خلاصہ درخلاصہ دو لفظ یہ سن لیجئے کہ جرمنی کے یہ فلسفی صاحب
اور مخلوق دونوں سے کچھ روٹھے ہوئے پہلے ہی سے تھے، شوپن ہاٹر کی پڑھائی نے اور مردم
کر دیا اور ڈارون صاحب کے نظریۂ ارتقا نے اس کڑوے کریلے کو نیم چڑھا کر چھوڑا ۔ مذہب کے
ند سے بیزاری اور خیال وعقیدہ کی آزادی پہلے ہی سے تھی اب بالکل بے قید ہوکر دعوے یہ کر دیئے
ہب خصوصاً مسیحی مذہب کی قائم کی ہوئی روحانی واخلاقی قدریں نری ایک ڈھکوسلا ۔ یہ انکسار یہ فروتنی
یہ قناعت، یہ توکل یہ صبر، یہ شکر، یہ سب بچوں کے بہلانے کے کھلونے ہیں ۔ ان میں نہ
ت نہ مغز، انھیں اختیار کر کے جیتے جی مر رہنا ہے اور اب چاہے کوئی فرد و شخص ہو یا جماعت
اگر اسے عزت وآبرو، لطف وآسائش کے ساتھ زندگی کے دن پورے کرنا ہیں تو عقیدہ و عمل
ن خوش خیالیوں کو آگ، حشر ونشر، جنت و دوزخ کے چکر میں نہ پڑیئے ۔ گردن اٹھا کر سینہ تان کر
، اپنے کو "ذرہ بے مقدار" نہ کہیئے نہ سمجھیئے آپ حاکم خود مختار رہیں ۔ اپنا نصب العین، حکومت،
ت، غلبہ، تسلط و اقتدار کو بنایئے ۔ بالا دستی کو اپنا شعار رکھیئے جو کمزور راہ میں حائل نظر آئے اسے
دیجئے ۔ اوروں کو گرایئے اپنے کو بڑھایئے ۔ رحم وخدا ترسی کے نام پر اپنا دل نہ پگھلایئے ۔ حالات
لہ کلہ بر کلہ کیجئے، اسے روندیئے، اسے پیسئے، خدا اور دل کے وہم میں نہ پڑیئے ۔ انسان خاک نژاد
ھا کیا ہے ۔ جنی آتش زاد بن کر کچھ دکھایئے ۔ بشریت کا دور گزر گیا ۔ اب زمانہ فوق البشر بن کر

گھٹنے سے رہنے کا ہے۔

نیٹشے کی اس تعلیم کا اثر وقت کی سیاست پر جو پڑ کر رہا اور ملک پر جو نشہ پندارِ تفوق
اس سے سوار ہوا ۔ اس کا دردناک، ہولناک، خون بار تماشا دوست دشمن سب نے جرمنی کی
دونوں جنگوں میں دیکھ لیا ۔

اقبالؔ کا سال پیدائش ۱۸۷۳ء ہے ۔ ان کی جب اعلیٰ تعلیم کا وقت آیا تو نیٹشے کی شہرت
کا آفتاب چمکا ہوا تھا ۔ لاہور، انگلستان، جرمنی سب کہیں کی تعلیم میں نیٹشے کی شخصیت اثر انداز رہی
جہاں تک نیٹشے کے پر شکوہ الفاظ اور رعب افگن اصطلاحات کا تعلق ہے اقبالؔ کا دامن نیٹشائی ج
و جلال سے خاصا متاثر رہا ۔ "شاہین"، "شاہین زادہ" "عقاب" کی تلمیحیں کلام اقبال میں بار بار ملتی ہیں ۔
سب اسی سر پھرے فلسفی ہی کا فیض ہے اور مخالف طریقوں کو گوسفندی سے تعبیر کرنا یہ بھی اسی
اپج کی تقلید ہے ۔

لیکن بس اقبالؔ کی خوشہ چینی اس جرمن حکیم سے اسی حد پر ختم ہو جاتی ہے ۔ اس لیے جن ناقد
نے بعض ظاہری الفاظ اور سطحی مشابہت سے دھوکا کھا کر اقبالؔ کو نیٹشے کا طفیلی کسی معنی میں بھی
قرار دیا ہے ۔ انھوں نے اقبالؔ پر بھی ظلم کیا ہے اور خود اپنے ذوقِ سلیم پر بھی ۔ اقبا
کی نظر آفاقی تھی ۔ ان کے اصولِ اخلاق میں کائنات کی گہرائی روحانیت کی ہم وسعتی تھی، وہ
مادّی حد بندیوں کے اندر کیسے محصور رہ سکتے تھے ۔ ان کے ہاں بلا کا توازن تھا ۔ نیٹشے کو
جیسا انھوں نے پہچانا ہے، کم ہی کسی نے پہچانا ہوگا ۔ وہ اس کی گرمیِ گفتار کے قائل ہیں ۔ اسے
مانتے ہیں کہ اس نے مغرب کی مصنوعی تہذیب و تمدن پر اپنی شمشیر قلم سے خوب خوب چرکے
لگائے ہیں ۔

حرف او بیباک و افکارش عظیم
غربیاں از تیغ گفتارش دو نیم

لیکن اس کے باوجود اس کا مرتبہ وہ ایک مجذوب اور وہ بھی مجذوب فرنگ سے آگے نہیں
بڑھاتے ؏

وائے مجذوبے کہ زاد اندر فرنگ !

ے فارسی کلام میں ذکر اس کا بار بار لائے ہیں، لیکن یہ کہاں تک ذکرِ خیر ہے اس کا اندازہ بس اس ایک
رع سے لگا لیجئے ؎

قلب او مومن دماغش کافر ست

و کہتے ہیں دریا کو کوزہ میں بند کرنا اور نظم کا جو ہر ایک مصرعہ میں سمو دینا۔ متن کی شرح بھی خود ہی
حاشیہ میں یہ کر دی ہے کہ "اس کا دماغ اس واسطے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے گو بعض اخلاق
اسلام کے بہت قریب ہیں"۔

اقبالؔ مسلکِ گوسفندی سے بے شک بیزار ہیں اور اس کی ہجو کھل کر اپنی مثنوی ــــ
خودی میں کی ہے ـ لیکن اس سے مراد ان کی صرف بعض فرقوں اور مذہبوں کی اس تعلیم سے
انسان کو ناکارہ بنا دیتی ہے اور بجائے سخت کوشی، جد و جہد اور ہمتِ عمل کے اسے
م مجہولیت کا دیتی رہتی ہے ـ اس مسلک کو انہوں نے منسوب یونان کے حکیم افلاطون
یا ہے اور ان کی تشخیص ہے کہ مسلمان صوفیوں، شاعروں واعظوں کے ایک گروہ نے
وہیں سے لیا ہے، اور اس کی مصوری انہوں نے یوں کی ہے کہ ایک جنگل میں بھیڑ بکریاں
ی تھیں اور مزے سے خوب اپنے گھاس چرا کرتیں کہ اتفاق سے شیروں کا بھی اس صحرا
ہو گیا اور قدرۃً انہوں نے اپنی شیری دکھائی اور بھیڑ بکریوں کی ہڈیاں چبانی شروع کر دیں۔
صفایا ہونے لگا اور ان کے سارے قبیلے میں کھلبلی مچ گئی ـ اتنا دم ان میں کہاں تھا کہ شیر
ابلہ کو کھلے بندوں سوچ بھی سکیں ــ آخر ان میں سے ایک بوڑھی بکری بڑی کائیاں نکلی
لئے بڑے سوچ بچار سے کام لے کر یہ بات دماغ سے اتاری کہ گوسفندی میں شیری پیدا
دائرہ امکان سے باہر ہے ـ البتہ مسلسل وعظ و تلقین کے بعد شیر کو بھیڑ بنایا جا سکتا ہے
کو شیشہ میں اتارا جا سکتا ہے ـ اپنے کو بگلا بھگت بنا خوب پرچار اپنی درویشی اور
اری کا کیا ـ یہاں تک کہ خود شیر بھی اس کے حلقۂ عقیدت میں آ کر بیٹھنے گے۔ اب اس
پنے وعظ کی باگ یوں موڑی ؎

اے کہ می نازی بہ ذبحِ گوسفند
ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند

دوسروں کو مارنے اور ان کی جان لینے میں کیا رکھا ہے، اپنے کو مار کر رکھو اور سعادت کے بام
پر پہنچو۔ شیر خود ہی اپنی سخت کوشی سے تھک چکا تھا اور ہر وقت کی دوڑ دھوپ سے عاجز
آچکا تھا۔ افسوں کارگر ہوگیا اور اس نے بھی گھاس کھانا شروع کردی۔

از علف آں تیزیٔ دنداں نماند   ہیبت چشم شرر افشاں نماند

شیر بیدار از فسون میش خفت   انحطاط خویش را تہذیب گفت

شیر اس دام میں آگیا، شیری چھوڑ بکری بن گیا۔ گھاس کھا کھا کر نہ دانتوں کی وہ کاٹ رہی
نہ چیر پھاڑ اور نہ پنجوں میں وہ کس بل۔ انسان اسی طرح دنیا کی آرائشوں اور آلائشوں میں بند
اور یہاں کی وقتی لذتوں پر فریفتہ ہوا۔ اپنا منصب انسانیت بھلا بیٹھا اور لذتی مشغلوں کو مقصد
زندگی بنا اپنے لئے ایک نظام زندگی، تکلف، تصنع، تعیش سے بھرا ہوا گھڑ لیا اور اپنا دل
سمجھانے یا اپنے نفس کو فریب دینے کو اس مجموعہ کا نام تہذیب و تمدن رکھ لیا۔

اقبال کی تلقین ہے کہ انسان تو دنیا میں اپنے خالق کا نائب بن کر آیا ہے۔ اس کا کا
تکوینی و تشریعی ہر حیثیت سے اس کی نیابت کرنا ہے اور علم اور عشق دونوں کی راہ سے اس کی
معرفت حاصل کرنا ہے اور اس کے قانون کو نافذ کرنا ہے۔ نیٹشے کے فوق البشر سے دور، او
بہت دور، اقبال کا مطمح نظر ایسا مرد کامل ہے جو جسمانی، دماغی، اخلاقی، روحانی اعلیٰ
قوتوں سے مسلح ہو اور اپاہج، کام چور، بدہمت نہ ہو۔ صاحب عزم و عزیمت ہو اور اپنے فرائض
ادائی میں چاق و بیدار مستعد و متحرک ہو۔ خود دکھ اٹھائے دوسروں کو سکھ پہنچائے۔ خود بھوکا
رہے دوسرں کو کھلائے۔ خواہشوں کا غلام نہ ہو۔ ان پر حاکم ہو۔ اقبال اپنے بعض
فلسفیانہ مقالوں میں جدھر بھی چلے گئے ہوں لیکن ان کے ضخیم دفتر شاعری میں ایسے مرد کامل
کے لئے مذہب کی زبان میں اصطلاح مرد مومن کی ہے فارسی میں اسی کو انھوں نے ؎

اے سوار اشہب دوراں بیا

کہہ کر پکارا اور بلایا اور اردو میں تو بار بار جان و دل اس کے صدقے کئے ہیں۔ نمونہ کے
طور پہ صرف ایک مقام ملاحظ ہو ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کے سرودِ ازلی اس کے شب و روز — آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمان

قبال نے طلبِ علم میں استفادہ اپنے انگلستان اور جرمنی کے استادوں سے نہیں مشرق اور ہندوستان کے
کے بھی خدا معلوم کن کن زندہ و مرحوم بزرگوں، عالموں، فاضلوں، شاعروں سے کیا (اور کون نہیں کرتا) چنانچہ
ہتیوں کے نام صراحت کے ساتھ ان کی نظم و نثر دونوں میں مل جاتے ہیں۔ لیکن اصل اور پختہ عقیدت انھیں
ن ساری باکمال ہستیوں میں صرف ایک شخصیت سے رہی ہے اس کو وہ مرشدِ روشن ضمیر مانتے ہیں انھیں
روحانیت کا سہارا ہے کہ وہ فرشِ خاک سے اُڑ کر عالمِ بالا تک پہنچتے ہیں اور انھیں کا دامن پکڑ کے
سمان کی سیر کر ڈالتے ہیں۔ ہر سوال کا جواب انھیں سے پاتے ہیں اور ہر گرہ انھیں کے ناخنِ حکمت و
عرفت سے کھلواتے ہیں۔ ان کے مناقب جہاں کہیں لکھے ہیں منقبت نگاری کا حق ادا کر گئے ہیں اور نظر
سا آتا ہے کہ محبت و عقیدت کے جذبات کے دہارے بے اختیار سینے سے ابلے پڑتے ہیں۔
ک جگہ یہ انداز ہے ؎

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر — کاروانِ عشق و مستی را امیر

دوسری جگہ کا انداز اس سے زائد والہانہ ؎

طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب — شیب او فرخندہ چو عہدِ شباب
فکرِ او در روشن ز نورِ سرمدی — در سراپایش سرورِ سرمدی
بر لبِ او سرِ پنہانِ وجود — بند ہائے حرف و صوت از خود کشود

طرح جہاں جہاں بھی ذکر لاتے ہیں۔ اگر انھیں سب اکٹھا کر دیا جائے تو عجب نہیں کہ خود ایک
رسالہ تیار ہو جائے اور لیجیے خود لاہوتی نے، نواز، اس آسمانی بانسری والے کے نغمے اگر زیر و بم
ساتھ چھڑ گئے تو رات تمام ہو جائے اور وہ لذیذ حکایت ختم ہونے ہی میں نہ آئے!

اقبالؔ تو صرف شاعری کے عالم میں صاحب پیام تھے۔ باقی جو واقعی خدا کے پیمبر ہوئے ہیں، شعر و تخیل کی دنیا میں نہیں، حقیقت کی دنیا میں وہ بھی مرتبہ پیمبری و مرتبہ رسالت تک رفتہ ہی رفتہ پہنچے ہیں ـــــ پھر کیا ہوا اگر حضرت اقبال اپنے مقام تک پہنچتے پہنچتے "ترانہ ہندی" کی منزل سے گزرے اور راہ میں نیا شوالہ بناتے رہے۔

تاہم اس دور میں بھی زبان حقائق سے ناآشنا نہ تھی۔ "سرگذشت آدم" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس میں آدمؑ کی سرگذشت ابن آدم زاد کی زبان سے سنئے۔ کلمۂ توحید کی قائل ہمیشہ رہی، ہوتے ہوتے زمانہ وہ آگیا کہ توحید قال نہیں، حال بن گئی۔ جسم کا رواں رواں کلمۂ شہادت پڑھنے لگا۔ اور اقبال کا پیام بس ایک "اللہ ھو" ہو کر رہ گیا۔ "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی"، "پیام مشرق" "جاوید نامہ"، "ضرب کلیم" اور "ارمغان حجاز" سب اسی ایک متن کی تفسیریں ہیں، اسی کی حقیقت کی تعبیریں ہیں۔ بیسویں صدی کے بول چال میں وقت و ماحول کی اصطلاحات ہیں۔

اللہ اللہ، جس نے ابلیس کی زبان سے مجلس شوریٰ میں یہ کہلا چھوڑا

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں

اس کی مغفرت ہر شک و شبہ سے برتر، اس کی مقبولیت ہر اشتباہ سے بالاتر۔ قرآن میں آیا ہے لاتموتن الا و انتم مسلمون۔ یہی اقبال کا [illegible] دستور حیات تھا، مسلمان جیو ـــــ مسلمان مرو "مسلمان جیو" یہ اس نے زبانی پیام دیا۔ مسلسل اور برسوں، "مسلمان کی طرح دنیا سے اٹھو" ـــــ یہ عملی سبق وہ اپنی وفات سے دے گیا، ہر لفظی تبلیغ سے زیادہ بلیغ و موثر ـــ! زندگی اس کی قابل رشک ہو یا نہ ہو لیکن موت تو اس اللہ کے بندے کی یقیناً قابل رشک، صد رشک تھی!

مولانا عبدالماجد نے یہ پیام "یوم اقبال" منعقدہ لاہور کے لئے جناب شیخ عبدالرحیم (جو مولانا کے علی گڑھ کے ساتھی تھے) کی درخواست پر روانہ کیا تھا۔ ہفتہ وار "آفاق" لاہور ۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء ص ۲۸

اقبال اکیڈمی

مدینہ منشن، نارائن گوڑہ
حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹

اقبال کی فکر اور شاعری ہمارے تہذیبی سرمایہ کا ایک گراں بہا وجود ہے۔ اقبال دورِ حاضر کے اُن عظیم مفکروں میں سے ہیں، جن کی فکر و نظر مشرق و مغرب کی مصنوعی سرحدوں سے بالاتر ہے۔ جمعیت آدم ان کا نصب العین تھا اور احترام آدم ان کے نزدیک تہذیب کی منزل۔

○ اس پس منظر میں اقبال کے پیام کو عام کرنے کے لئے ۲۸ رجون ۱۹۵۹ء کو اقبال اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔

مقاصد :

○ افکارِ اقبال کی اشاعت
○ ایسے نظریات کی تحقیق، جن پر فکرِ اقبال مبنی ہے۔
○ علمی و ادبی شعور کی نشو و نما

اِن مقاصد کی عملی صورت گری کے لئے اقبال اکیڈمی حسبِ ذیل خطوط پر مصروفِ عمل ہے:

○ ہر سال یومِ اقبال اور نمائش کا انعقاد
○ اقبالیات پر کتابوں کی نمائش و اشاعت
○ ہر ماہ محافلِ اقبال، توسیعی تقاریر اور سمپوزیم کا اہتمام
○ اقبال کی تصانیف پر ہفتہ واری لکچرس
○ اقبال کے فارسی کلام سے استفادہ کے لئے فارسی زبان کی کلاس
○ اقبالیات پر مشتمل ایک معیاری کتب خانہ

رُکنیت :

○ عام رکنیت سالانہ (دس) روپے
○ تاحیات رکنیت (دو سو) روپے
○ سرپرستی (ایک ہزار) روپے

ایک گذارش :

اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے زیرِ انتظام، اقبالیات پر ایک کُتب خانہ قائم ہے۔ علامہ اقبال کی ساری تصانیف اُن کے اوّلین اڈیشن اور اقبالیات پر کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ہندوستان و پاکستان سے شائع ہونے والے بہت سارے اہم رسائل کے خاص نمبر اور دیگر متعدد رسائل، جن میں اقبال پر مضامین شائع ہوے ہیں، کثیر تعداد میں اس کُتب خانے میں جمع کیے گئے ہیں۔ اقبال کے عصر پر، اُن کے معاصرین پر بھی، کتابیں جمع کی جارہی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ سے گزارش ہے کہ اس کُتب خانہ کو آپ اپنی کتابیں تحفتہً روانہ فرمائیں۔ کوئی رسالہ کوئی کتاب، جو آپ کی نظر میں اس قابل ہو کہ آپ عطیہ کے طور پر اس کتب خانہ کو دے سکیں تو اپنی اولین فرصت میں ہمیں مطلع فرمائیں۔ آپ سب کی اعانت ہی سے یہ کتب خانہ اقبال پر ایک مرکزی کُتب خانہ بن سکتا ہے، جہاں اقبال پر ریسرچ اور مطالعہ کی ساری سہولتیں انشاء اللہ جلد مُہیا کی جائیں گی۔ اپنی کتب ہمارے پتہ پر روانہ فرمائیے یا اپنے پتہ سے مطلع کیجیے، ہمارا نمائندہ باجرائی رسید حاصل کرلے گا۔

کُتب خانہ اقبال اکیڈمی

مدینہ منشن، نارائن گوڑہ
حیدرآباد ۲۹ ... ۵
اے، پی (انڈیا)